ادارہ اسلامیات ۰ لاہور

عقل اور مذہب کے درمیان باہمی تعلق کے نازک مسئلہ پر سیر حاصل بحث

عقلِ سلیم، اور نقلِ صحیح میں اختلاف ممکن نہیں! اور کبھی عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت میں قصور ہونے کی وجہ سے اختلاف نظر آئے تو فیصلہ کا صحیح طریقہ

از

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ناشر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور

قیمت

فہرست مضامین

(نوٹ)
اصل کتاب میں اگرچہ عنوانات موجود نہیں ہیں، لیکن قارئین کی سہولت کے لئے کتاب میں مندرج مضامین کی فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے۔

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ مذہب اسلام اور فلسفۂ یونان میں جب جنگ ہوئی تو مسلمانوں نے علم کلام کے زبردست ہتھیاروں سے اس کا قطعی فیصلہ کر دیا اور اسلام کو ایسے مضبوط فصیلوں اور دمدموں سے محفوظ کیا جن کے مقابلہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ قلعہ شکن توپیں بھی اپنا کوئی اثر نہ دکھلا سکیں۔

یہ کہنا بالکل مبالغہ سے خالی ہے کہ متکلمین نے مذہب کی سطح پر قائم رہ کر حجت و استدلال کے متعلق جو کچھ اصول اور قواعد وضع کیے ان سے تمام باطل توہمات کی قلعی کھل گئی۔

فلسفۂ یونان کی ملمع سازیوں کا طلسم ٹوٹا معترضین کی ابلہ فریبیوں کا پردہ فاش ہوا اور قیامت تک کے لئے مخالفین کی نکتہ چینیوں کا سدباب کر دیا گیا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے زمانہ کے بعض کوتاہ نظروں کی تسلی اس پر بھی نہ ہوئی اور وہ علم کلام کو آج کل کی ضروریات کے حق میں ناکافی ہی سمجھتے رہے۔

ابھی کچھ عرصہ ہوا یورپ سے یہ صدا اٹھی کہ علوم جدیدہ نے تمام مذاہب کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کر دیا ہے اور مختلف ادیانِ عالم میں سے ایک مذہب بھی اس کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکا۔

جن لوگوں کو ہر بات کی تصدیق کے لئے یورپ کی وحی کا انتظار رہتا ہے۔ بے چون و چرا اس پر ایمان لے آئے اور ملک میں اس خیال کو اس قدر شہرت دی کہ اس سرے سے اس سرے تک جا بجا یہی چرچا ہو گیا۔ علمائے یہ دیکھ کر کہ عام لوگ مذہب سے بددل ہوئے جاتے ہیں اس کی تحقیق کی طرف توجہ کی مگر تفتیش کے بعد ثابت ہوا کہ اس دعویٰ میں واقفیت کا بہت ہی کم حصہ شامل ہے۔

○ اس میں شک نہیں کہ علمائے سائنس نے مادیات اور طبیعیات کے متعلق بہت سی جدید باتیں دریافت کیں۔ علم ہیئت (علم الافلاک) میں مفید بیانات کا اضافہ کیا۔ صنعت و دستکاری کے عجیب و غریب کرشمے دکھلائے۔ روشنی اور بجلی وغیرہ کے متعلق جدید تحقیقات سے عالم کو منور کر دیا لیکن انہوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ان میں سے کون سی بات اسلام کے مخالف ہے یا کس چیز کے ثابت ہونے سے کسی اسلامی مسائل پر نقص وارد کیا جا سکتا ہے۔

فرض کرلو کہ عناصر کی تعداد (۶۷) سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہ بھی تسلیم کرلو کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے یہ بھی مان لو کہ کواکب سیارہ سات میں منحصر نہیں۔ مگر کیا اس سے توحید کے ثبوت میں کچھ خلل آیا۔ یا نبوت کا دعویٰ باطل ہو گیا کسی آیت قرآنی کی مخالفت ہوئی یا حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیا گیا۔ جب ان میں سے کچھ بھی نہیں تو اب یہ دیکھو کہ علوم جدیدہ نے اسلامی مسائل کے متعلق رداً یا قبولاً کس چیز کی زیادتی کی۔

اس کے جواب میں ان چند بوسیدہ اور پامال اعتراضات کے سوا کچھ نہیں کہا جاتا جو حدوث مادہ۔ معجزات اور حشر و نشر وغیرہ کے متعلق عام طور پر زبان زد ہیں اور جن کو ہمارے زمانے کے بعض آزاد خیال مؤلفین نے اردو زبان میں ذرا سلجھا کر تحریر کر دیا ہے لیکن جن لوگوں نے علم کلام کی تکمیل کو صرف شرح عقاید خیالی کے دائرہ میں محدود نہیں سمجھ رکھا وہ خوب جانتے ہیں کہ علماء اسلام نے کہاں تک ان تمام شبہات کا رکیک اور بیجان ہونا ثابت کیا ہے۔ اور کس خوبی اور بسط کے ساتھ ان اعتراضات کا رد لکھا ہے کاش میری اس تحریر کے پڑھنے والے ابن حزم ظاہریؒ کی ملل و نحل علامہ علاؤالدین علی طوسیؒ کی کتاب الذخیرہ۔ فاضل تفتازانیؒ کی شرح مقاصد۔ امام غزالیؒ کی تہافۃ الفلاسفہ اور محققین فن کی نادر تصنیفات کا مطالعہ کریں۔ جس سے ان کے روبرو میرے اس بیان کی صداقت ظاہر ہو۔

اس بات کا کہہ دینا اس کے ثابت کرنے سے زیادہ آسان ہے کہ علوم جدیدہ کی روشنی میں تمام علوم قدیم ماند پڑ گئے اس کے مقابلہ میں متکلمین کی تحقیقات بالکل بیکار ثابت ہو گئیں اور اس کے دنیا میں آنے سے مذہب کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔

کیا یہ دعویٰ کرنے والے ہم کو خاص ان مضامین کی ایک فہرست دے کر ممنون بنا سکتے ہیں جن کو اسلام اور متکلمین اسلام کے دلائل کے مخدوش بنانے میں کسی قسم کا دخل ہو اور جن کی صحۃ و سقم پر قدیم علم کلام نے بہت کافی طور پر بحث نہ کی ہو۔

ہماری ایسے لوگوں سے جو حال کے علمار کو جدید حملوں کی مدافعت سے عاجز بتلاتے ہیں یہ التجا ہے کہ وہ ضرور ہم کو ایسے مسائل کی مع ان کے دلائل کے ایک فرد تیار کرکے عنایت فرمائیں جن کا مقابلہ ہمارے بوڑھے اسلام سے نہ ہوسکا۔ اور آخرکار ہمارے سی۔ ایس۔ آئی بہادر کو اس کے ضعف اور پیرانہ سالی پر رحم کھاکر اس میں بہت کچھ اصلاح کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ یہ ترمیم شدہ اسلام نوجوان یورپ کی نظروں میں وقیع اور باعظمت بن سکے بہرحال۔

اپنی جہالت کی وجہ سے جس کا جو جی چاہے کہے مگر انصاف یہ ہے کہ اسلامی عقائد کے متعلق متکلمین نے جس درجہ موشگافی۔ باریک بینی۔ اور فلسفیانہ نکتہ رسی سے کام لیا ہے اس نے ہمیشہ کے لئے ہم کو اندرونی اور بیرونی مخالفین اسلام کے پیچیدہ اعتراضات کے حل کرنے سے سبکدوش کرکے ان کا ممنون احسان بنادیا اور میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دنیا میں امام ابوالحسن اشعری اور ابوالمنصور ماتریدی کے ایسے وکیل موجود ہیں جو اسلامی معتقدات کے متعلق ان تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے سے نئے پیرایہ میں ظاہر کئے جائیں، قدیم علم کلام کے کامل و مکمل ہونے کا ثبوت دے سکیں۔

○ ہم نے اپنے ان دوستوں کو جو قدیم علم کلام کو اکثر ناقص بتلایا کرتے ہیں بارہا یہ بھی کہتے سُنا ہے کہ قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی کیونکہ اس زمانے میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراض کئے

تھے عقاید ہی کے متعلق تھے لیکن آج کل تاریخی اخلاقی تمدنی ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابلِ اعتراض نہیں جس قدر اس کے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں، اُن کے نزدیک تعدد نکاح۔ طلاق۔ غلامی۔ جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا اس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس بنار پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنا ضروری ہے اور یہ حصہ بالکل قدیم علم کلام میں موجود نہیں۔

ہمارے ان احباب کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ قدیم علم کلام کا تعلق صرف عقائد سے ہے قانونی اور اخلاقی مسائل سے اس میں مطلقاً بحث نہیں کیگئی۔ لیکن متکلمین یہ نہ کرتے تو کیا کرتے علم کلام کا مقصد ہی عقائد تک محدود تھا قانونی اور اخلاقی مباحث کے لئے اس کی وضع ہی نہ تھی۔ ان چیزوں کے لئے دوسرے علوم کی حاجت تھی۔ چنانچہ فن تصوّف و اخلاق اور علم اسرار الدین نے اس ضرورت کو بھی رفع کیا اور اسلام کی تمام جزئیات نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، جنگ و جہاد کے مخفی اسرار اور حکمتوں کو نہایت تفصیل کے ساتھ ظاہر کردیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی قیمتی تصنیفات اس وقت بھی کثرت سے موجود ہیں جن کے مطالعہ سے میرے اس بیان کی پوری تصدیق ہوسکتی ہے۔ اور اس عنوان کے ذیل میں جس سلسلہ مضامین کے لکھنے کا میں ارادہ کر رہا ہوں اس میں اس کا خیال رکھوں گا حسب موقع ان بیش بہا تصانیف سے مفید اقتباسات

حاصل کروں۔

بہرکیف علم کلام جس غرض کی تکمیل کے لئے مدوّن کیا گیا۔ میرے نزدیک
اس نے اس میں پوری کامیابی حاصل کی اور اب میرا قصد ہے کہ میں اسلامی عقائد
کے ہر باب کے متعلق بصورت رسائل عدیدہ یہ دکھلاؤں کہ علمار اسلام نے اس کو
تحقیق کی کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے اور اب ہم کو اس میں کہاں تک ترمیم
یا اصلاح کرنے کی ضرورت ہے لیکن مجھ کو اپنے اصلی مقصد کے شروع کرنے
سے پہلے جیسا کہ چندان مقامات کا ذکر کردینا ضروری ہے جنکے بغیر ہمارا مقصد
کامل طور پر اور آسانی کے ساتھ دل نشین نہیں ہو سکتا اسی طرح بعض ان
خطرناک غلطیوں پر مطلع کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اصول کے
عام طور پر عام مسلمانوں میں تسلیم کرلی گئی ہیں اور جو آگے چل کر ہمارے
ناظرین کو بعض اصلی مقاصد کے سمجھنے میں مزاحم ہو سکتی ہیں۔

لیکن جس اہم کام اور طویل الذیل سلسلہ کا میں نے بیڑہ اٹھایا ہے اور
جس کا آغاز بنام خدا آج اس رسالہ سے کیا جاتا ہے وہ اسی وقت انجام
کو پہنچ سکتا ہے جب کہ اس مضمون کے پڑھنے والے کلمات خیر سے میری
ہمت بڑھائیں اور خدا کی توفیق شامل حال رہے اور عجب نہیں کہ اگر
اس ناچیز مضمون کا کوئی حصہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تو پھر ہم کو
قدیم وجدید ہیئت کے مسائل کے موازنہ کرنے کی بھی اپنے دسترس کے
موافق جرأت ہو اور اگر زندگی ہے تو انشاءاللہ ہم علوم جدیدہ کے متعلق
اپنی معلومات بڑھانے کی کوشش اور اس مقصد کی تکمیل کی ضرور فکر

کریں گے۔ شعر

دربیریم عذر ما بپذیر   اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس سے قبل کہ توحید، رسالت اور جزا وسزا وغیرہ اسلامی اصولوں میں
سے ہر ایک اصول کی علیحدہ علیحدہ رسائل کے ذریعہ سے بلا شائبہ تعصب
مفصل تحقیقات کی جائے اس ایک رسالہ میں چند ایسے امور کا ذکر کردینا مناسب
معلوم ہوتا ہے جو ان مباحث میں امداد دینے کے علاوہ اس موقع پر ایک
خاص قسم کی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ امور درحقیقت ایسے قوانین
ہوں گے جن کی صحت اُن محسوسات اور بدیہیات پر مبنی ہو گی جو ہر طرح
سے قابل اطمینان ہیں۔ اور انہی سچے قوانین کی میزان سے ہم آئندہ چلکر
اسلامی مسائل کی پوری جانچ کر سکیں گے۔ گویا یہ مقدمات ہمارے نزدیک
ان اصول موضوعہ کے طور پر لکھے جائیں گے۔ جن کے سہارے ہمارے اکثر
بیانات کی بنیادیں قائم ہوں گی۔

اب اگر کسی صاحب کو ان میں سے کوئی اصول مشتبہ یا غلط نظر آئے
تو وہ بہت شوق کے ساتھ اپنے اعتراض کو ظاہر فرمائیں۔ لیکن اپنے کسی ایک
دعوے کے ثبوت میں بھی چند کہنہ سال یوروپین کا نام لینے پر اکتفا نہ کریں۔
تاوقتیکہ اُن کے پاس ایسی ہی کوئی دلیل قطعی نہ ہو جیسا کہ ہم اپنے ہر
ایک دعوے کے ساتھ ساتھ پیش کریں گے۔ یا جیسے دلائل قویہ کا وہ ہم سے
خود مطالبہ فرمانے کو تیار ہوں گے اور اگر وہ صاحب صرف چند جرمنی اور
فرانسیسی مصنفین کے اقوال یاد کر لینے ہی کو علوم جدیدہ میں ماہر ہونا تصور

کرتے ہوں تو بحمد اللہ ایسے مباحث سے بھی گو ہم اپنے کو عاجز نہیں پاتے
مگر جب ایسے دور از کار فضولیات کا منظر سامنے ہو گا تو ہماری طبیعت
بھی صرف اسی قدر جواب کو پسند کرے گی کہ۔ شعر

مدعی گو برو و نکتہ بحافظ مفروش
کلک ما نیز زبانے و بیانے دارد

اس لئے ایسے لوگوں کی خدمت میں ہم عرض کئے دیتے ہیں، کہ وہ
براہِ کرم اپنا اور ہمارا عزیز وقت ہرگز ضائع نہ فرمائیں۔ بلکہ ذرا سی دیر کے
لئے سخن پروری۔ ہٹ دھرمی اور نفس پرستی کو فراموش کرکے اور آخرۃ
کی عام جواب دہی کو پیشِ نظر رکھ کر ٹھنڈے دل سے ان قیمتی مطالب کے
سننے میں مصروف ہو جائیں جو بڑی عرق ریزی کے بعد جمع ہو کر بنی نوع
انسان کی ہمدردی کی خاطر منظر عام پہ لائے جائیں گے۔

چونکہ ان مضامین کا سلسلہ اگر خدا کو منظور ہے تو عرصۂ دراز تک
قائم رہے گا۔ اس لئے علم دوست احباب سے توقع ہے کہ اس سلسلہ کے
تمام رسائل کو ایک جگہ جمع کرتے جائیں تاکہ پہلے میں دوسرے کا یا دوسرے
میں پہلے کا کوئی حوالہ آئے تو اس مقام کو بے تکلف نکال کر دیکھ سکیں۔

اب ان تمام ہدایات کے بعد ہم اپنا اصلی مطالب شروع کرتے ہیں
اور آرزو مند ہیں کہ اس کے پڑھنے والے تمام پرانے وساوس اور
اوہام سے دل کو پاک کرکے اور لا تنظر الی من قال وانظر الی ما
قال کو سامنے رکھ کر نیک نیتی اور انصاف پرستی کی داد دینے کے

لئے آمادہ ہو جائیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

شاہا من ار بعرش رسانم سریر فضل
مملوک این جنابم و مسکین این درم

احقر **شبیر احمد عثمانی** عفا اللہ عنہ
دار العلوم دیوبند

العقل والنقل

تمام اہل فہم کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے کہ نقل صحیح یا عقل کامل کا اتباع انسان کے اولین فرائض میں سے ہے اور انہی دونوں کی اطاعت پر اس کے برگزیدہ کمالات اور حقیقی کامیابیوں کے حاصل ہونے کا انحصار ہے۔ پھر ہر چند کہ اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں حاکموں (عقل و نقل) میں کبھی نزاع اور خصومت بجز اس کے ممکن نہیں کہ یا نقل کی صحت مشکوک ہو یا عقل کی سلامتی میں کچھ نقصان اور فتور واقع ہو جائے۔ مگر جب کبھی کسی وجہ سے کسی موقع پر ان دونوں میں خلاف محسوس ہوتا ہے تو انسان کے خیالات میں سخت تزاحم اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے، اور دونوں جانبوں کی کھینچ تان سے اس کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہ ان میں سے کس کے حکم کو قبول اور کس کو رد کرے اگر دونوں کی تعمیل کرنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہو اور کسی ایک کو ترجیح دے تو کیونکر دے۔

اس لئے سب سے پہلے مگر سب سے مشکل منزل (جس کے طے کئے بغیر ہم اپنے اصلی مدعا تک نہیں پہنچ سکتے) یہ ہے کہ عقل و نقل کا یہ قدیم جھگڑا چکایا جائے جس کی بدولت پچھلے زمانہ میں سینکڑوں دانشمند آدمیوں کی قربانی ہو چکی ہے اور بہت سے بے قصور لوگ دار پر کھینچ دیئے گئے ہیں۔ جب کبھی مدعیان عقل نے قدم جمائے اہل نقل کے استیصال میں

تسمہ باقی لگا نہیں رکھا اور جب نقل کے بیوقوف پیرووں کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے بھی اپنے فریق مقابل کے حق میں سر قلم کرنے یا آگ میں جلا دینے سے کم کوئی سزا تجویز نہیں کی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس اختلاف عقل و نقل کی اصلی حقیقت کیا ہے؟ کیا اس خوفناک نزاع میں کوئی صحیح صورت تطبیق کی ممکن ہے یا کسی اہل مذہب نے ان دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی؟ کیا ان تطبیق دینے والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اپنی سعی میں کامیاب ہوا۔؟

یہ وہ سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہر ایک مذہب والے کا فرض ہے اور اس وقت ہم انہی مہتم بالشان امور پر کامل طریقہ سے ایسے آسان پیرایہ میں بحث کریں گے جس میں عام، خاص، عالم، جاہل، اور ذکی۔ غبی سب مساوی طور پر حصہ لیں۔

قدیم سے قدیم روایات پر عبور کرنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عقل و نقل کی یہ نزاع اور باہمی کشمکش کسی ایک قوم، ایک ملک اور ایک ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ انسانی آبادی کے ہر طبقہ اور ہر حصہ میں دونوں قسم کی طبیعتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں جو زمانہ کسی قوم کے حق میں اعلیٰ درجہ کی وحشت۔ بدویت اور عام تاریکی کا فرض کیا جائے اس میں بھی متمدن اقوام کی مانند دونوں طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی عقل کے ایسے پابند اور خیالات کے ایسے محکوم ہوتے ہیں کہ جو چیز ان کی عقل و ادراک سے خارج ہو اس کو وہ واقع میں موجود ہی

نہیں سمجھتے اور ان کے برخلاف بعضوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وُہ
اپنے کسی نسبی بزرگ یا مذہبی مقتدا سے کوئی بات سُن لیں تو بے چون وچرا
ان کے حکم کے سامنے گردن ڈال دیں بشرطیکہ اس مقتدا کے مقتدا ہونے پر
ان کو پورا اعتماد حاصل ہو چکا ہو۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں میں طعن وتشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہے
پہلا گروہ دوسرے کو سادہ دل۔ کم عقل اور بیوقوف سمجھتا ہے اور دوسرا پہلے
کو بے ادب، مغرور اور نافرمان قرار دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں کینہ
اور بغض کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور زبان ودل سے گزر کر ہاتھ پاؤں تک
جنگ وجدل کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر اس پر بھی امر متنازع فیہ کا تصفیہ نہیں ہوتا۔
بلکہ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ بسا اوقات ایک ہی شخص اور ایک ہی کتاب کے
دو قول اس مسئلہ میں متناقض پہلو رکھتے ہیں۔ اور ہماری حیرت اور
تعجب کی اس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم کو کسی ایک ایسی مذہبی
کتاب میں جو کسی فرقہ کے نزدیک خطا و قصور سے بالکل پاک تسلیم کر
لی گئی ہے۔ وہ متعارض کلام اس بارے میں نظر پڑتے ہیں۔ جب ہم موسیٰ
علیہ السلام کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں تو امثال سلیمان کے تیسرے
باب میں یہ عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے۔

"اپنے سارے دل سے خداوند پہ توکل کر، اور اپنی سمجھ پر تکیہ
مت کر، اپنی ساری راہوں میں اس کا اقرار کر، وُہ تیری

رہنمائی کرے گا، اپنی نگاہ میں آپ کو دانش مند مت جان،
خداوند سے ڈر، اور بدی سے باز رہ، یہ تیری ناف کے لئے
صحت اور تیری ہڈیوں کے لئے تراوٹ ہے۔"

اور انہی امثال کے آٹھویں باب میں لکھا ہے کہ:۔

"کیا دانائی نہیں پکارتی اور کیا فہمید آواز بلند نہیں کرتی۔ وُہ
سڑک کے پاس اونچے مقاموں کی چوٹیوں پر اور چوراہے کے
چبوترے پر کھڑی ہوتی ہے وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے
مدخل پر جہاں سے دروازوں میں داخل ہوتے ہیں چلاتی ہے
کہ اے آدمیو میں تمہیں بلاتی ہوں۔ اور بنی آدم کی طرف
اپنی آواز اٹھاتی ہوں۔ اے بیوقوفو! خرد کو سمجھو، اور اے
جاہلو! سمجھنے والا دل پیدا کرو۔ سنو کہ میں لطیف مضمون
کہتی ہوں۔ اور میرے لبوں سے جب وُہ کھلتے ہیں تو سچی باتیں
نکلتی ہیں کہ میرا منہ سچ کہتا ہے، اور میرے لبوں کو شرارت
سے نفرت ہے۔ میرے منہ کی ساری باتیں صداقت سے پر ہیں
ان میں کچھ ٹیڑھا، ترچھا نہیں، وہ سب اس کے نزدیک جو
دانش رکھتا ہے سیدھے ہیں اور ان کے خیال میں جو حقیقت
شناس ہیں راست ہیں۔"

پاؤل رسول نے جو خط رومیوں کو لکھا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"غرض میں اپنی عقل سے خدا کی شریعت اور جسم سے گناہ

کی بندگی کرتا ہوں[1]"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کی شریعت کا اتباع وہ اپنی عقل کے بھروسہ پر کرتے تھے لیکن اس کے خلاف انہی پاؤل رسول نے جو خط کرنتھیوں کو تحریر کیا ہے اس کی عبارت یہ ہے :۔

"اور میری عبارت اور میرا وعظ انسانی حکمت کی دلفریب بات کے ساتھ نہیں لیکن رُوح اور قدرت کی دلیل کے ساتھ تھا تاکہ تمہارا ایمان نہ انسانی حکمت سے بلکہ خدا کی قدرت سے ثابت ہووے ہم کاملوں کے نزدیک حکمت کی بات بولتے ہیں۔ مگر اس جہان کی اور اس جہان کے فانی حاکموں کی حکمت نہیں بولتے، بلکہ ہم وُہ حکمت الٰہی بولتے ہیں، جو چھُپی ہوئی ہے۔ یعنی وہ پوشیدہ حکمت جسے خدا نے زمانہ کے آگے ہماری بزرگی کے لئے مقرر کیا تھا[2]"

پھر اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ :۔

"اب ہم نے نہ دنیا کی رُوح بلکہ وُہ روح جو خدا سے ہے پائی تاکہ ہم ان رازوں کو جو خدا نے ہمیں بخشے ہیں سمجھیں۔ اور ہم ان رازوں کو انسان کی سکھلائی باتوں سے نہیں بلکہ رُوح قدس کی سکھلائی ہوئی باتوں سے غرض رُوحانی چیزوں کو روحانی عبارت سے ملا کر بیان کرتے ہیں۔ مگر نفسانی آدمی

[1] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ صہ ۴۹۴ [2] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ صہ ۵۲۹

خدا کی روح کی باتوں کو قبول نہیں کرتا کہ اس کے نزدیک نادانی کی باتیں ہیں اور وُہ ان کو سمجھ نہیں سکتا کہ وہ روحانی طور سے بوجھی جاتی ہیں "

شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی دونوں قسم کے مضامین موجود ہیں۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگ درجات عقل کے موافق جنت میں داخل ہوں گے اور دوسری جگہ اھل الجنۃ بلہ (یعنی اکثر جنتی لوگ بیوقوف ہوں گے) بھی مشہور ہے۔

○ آپ کے بعد جو علماء اور حکماء آپ کی اُمت میں گزرے ان کے اقوال بھی اسی طرح بظاہر متعارض رہے اور امام غزالیؒ کے زمانہ تک غالباً بہت کم عالم ادھر متوجہ ہُوئے جنہوں نے اس عقل و نقل کے اختلاف پر باضابطہ اور مکمل بحث کی ہو اور تمام شبہات کو رفع کرکے یہ دکھلایا ہو کہ اس اختلاف کا اصلی منشا کیا ہے۔ دونوں فریق کے استدلالات کس درجہ تک درست ہیں اور انبیاءؑ یا اکابر علماءؒ کی کتابوں میں جو بظاہر اختلافات معلوم ہوتے ہیں جن کی طرف ہم نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کے اجتماع اور تطبیق کی صحیح صورت کیا ہے۔

میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ امام غزالیؒ سے پہلے کوئی شخص عقل و نقل کی تطبیق کی صورت سمجھے ہُوئے نہ تھا بلکہ یہ غرض ہے کہ ان سے پہلے اس مسئلہ کی خاص تشریح کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ ہر ایک زمانہ کے حکماء انہی اُمور کے بیان میں زیادہ تاکید و تفصیل سے کام لیا کرتے

ہیں جن میں کسی قسم کے خفا اور مغالطہ کا اندیشہ ہو۔ یا وہ ایسے امراض ہوں جن کے اندر عام طبائع مبتلا پائی جائیں۔

تم خود اندازہ کر لو کہ والدین کی اطاعت اور اولاد پر ترحم اور شفقت۔ یہ دونوں چیزیں باوجودیکہ مذہبی ضرورت میں سے ہیں۔ مگر اوّل —— —— چونکہ ایک گونہ نفس کی خواہش کے خلاف اور دوسرے نہ تنہا انسان بلکہ تمام حیوانات کی اقتضاءات طبیعہ میں سے ہے اس وجہ سے حکیم مطلق نے عقوق والدین کی خرابی اور ان کی اطاعت کی خوبی کو بکرّات ومرّات اور باجمال وتفصیل جس قدر مختلف عنوانوں سے تعلیم فرمایا ہے ترحم علی الاولاد کے احکام میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

ٹھیک اسی طرح علماء سلف کے زمانہ میں چونکہ عام طور پر مذہبی روایات کا بدل ڈالنا کسی اہل مذہب کے نزدیک بھی روا نہ تھا۔ اس لئے نہ عقل و نقل میں کثرت نزاعات قائم ہوتے تھے۔ نہ علماء کو ان دونوں کے مقدمات فیصل کرنے کی نوبت آتی تھی۔ اور نہ اس کی حاجت سمجھی جائے گی کہ ان دونوں کی تطبیق کے اصول یا اختلاف کے اسباب بیان کیے جائیں۔

اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرا فلسفیت اور الحاد کا رنگ غالب آیا عقول ناقصہ جزئیہ کی گرم بازاری ہوئی اور نقل کی قدر ومنزلت گھٹی۔ اسی قدر عقل ونقل کی منازعت بڑھتی گئی اور امام غزالیؒ کے زمانہ تک اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان دونوں (عقل ونقل) کی موافقت واتحاد کے واسطے کچھ آئین بتلائے جائیں اور ان میں سے ہر ایک کے

حدود کی تعیین وضاحت کے ساتھ کر دی جائے۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے اس پر قلم اٹھایا اور انصاف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کی ضروریات کے موافق اس مقصد کی پوری تکمیل کر دی۔

لیکن چونکہ علماء سلف کو اس تعیین وتفصیل کی حاجت پیش نہیں آئی تھی۔ اور علماء مابعد نے امام صاحب ممدوح کی تشریحات پر حوالہ کر دینے کو کافی سمجھا اس واسطے ان سے پہلے اور ان کے بعد اکثر ایسے ہی مبہم اور متعارض اقوال عقل ونقل کے بارے میں جمع ہوتے رہے۔ جس سے آج کل کے کوتاہ نظروں کو سادہ لوح عوام کے گمراہ کرنے کا خوب موقعہ ہاتھ آیا اور انہوں نے بزرگوں کے کلام کے وہ مختلف ٹکڑے جن کو امام غزالیؒ نے احیاء العلوم وغیرہ میں عمدہ طور پر جمع کر کے دکھلا دیا تھا۔ جابجا اپنے استشہاد میں پیش کر کے سیدھی اور سچے مسلمانوں کو طریق حق سے ہٹانا چاہا۔ چنانچہ اب میں اس قسم کے اکثر کلام حکماء اور علماء اسلام کی کتابوں سے انتخاب کر کے ذیل میں نقل کرتا ہوں جن کو پڑھ کر ایک خالی الذہن آدمی سخت تحیر اور تذبذب میں پڑ جاتا ہے اور اس کے بعد امام غزالیؒ کی مدلل تقریر ان کی متفرق تصانیف سے اقتباس کر کے ہدیۂ ناظرین کروں گا جو اس حیرت اور پریشانی کو کافی حد تک مٹا سکیگی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عقل ونقل کی جو مخالفت آج کل دیکھنے میں آ رہی ہے کہ عرصہ ہوا دونوں حکومتوں میں سفرا اٹھ چکے۔ اور اعلانِ جنگ ہو کر لگاتار معرکہ آرائی ہونے لگی۔ پھر لڑائی بھی باقاعدہ نہیں بلکہ زمانہ

حال کی عقل نے مذہب پر کمربستہ ہو کر محض جابرانہ کارروائی شروع کر دی۔
چونکہ یہ بہار یا خزاں نہ امام غزالی نے دیکھی تھی اور نہ ان سے پہلے کسی
اور نے۔ اس لئے اگر زمانہ حال کی بعض خصوصیات پر نظر کر کے امام غزالی
کی تقریر میں بھی کوئی کمی ہو گی تو میں اس کو آزادانہ ظاہر کروں گا اور پھر
کسی اور عالم کی تقریر اگر اُن کی تقریر سے زیادہ تسکین بخش سمجھی جائے گی
تو اس کو سب سے اخیر میں درج کروں گا تاکہ ہمارے رسالہ کے وہ ناظرین
بھی جن کے دلوں میں اس زمانہ کی اندیشہ ناک آزادی کا کوئی اثر ہو اول
سے آخر تک تمام آرار کا موازنہ کر کے نیک دلی کے ساتھ سچائی اور راستی
کو قبول کر سکیں۔ وللّٰہ درّ من قال۔

دور عجبے گردش ایں دائرہ دارد — وقتی است کہ گردوں بگزارد دوراں را
اکنوں اثر تربیت دہر بر آں است — تا صورت خرمہرہ دہد نطفۂ کاں را
برخاستہ زیں شور زمیں چند بخارے — یکسر بکف غول ہوا داد عناں را
سیمرغ خور و قوت پرواز مگس نیست — بال و پر ایں ہیچمداں ہمہ داں را

○ سب سے پیشتر ہم ان حامیانِ عقل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو عام
طور پر فلاسفۂ اسلام یا حکمار اسلام کے لقب سے مشہور ہیں اور جن کی زندگی
کا اکثر حصہ عقل کی پیروی میں صرف ہوا ہے۔ شیخ بو علی سینا اور ابنِ رشد
اندلسی اس گروہ کے بہت بڑے امام گذرے ہیں۔ شیخ نے اشارات کے آخر
میں ایک مستقل باب اس کے لئے منعقد کیا ہے کہ انبیار اور اولیار کے
بہت سے علوم ممکن ہے کہ عقول متوسطہ کے مرتبہ سے بالاتر ہوں۔ وہ

درحقیقت صحیح ہوں مگر عام طور پر لوگ اُن کو سمجھ نہ سکیں۔ کیونکہ جو چیز انسان
میں علوم اور ادراکات کی حاصل کرنے والی ہے وہ ایک لطیف چیز ہے جس
کو روح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب علم کے حاصل ہونے کا مبنیٰ وُہ ہی جزو
لطیف ٹھہرا تو جس قدر جسم کی کثافت کو بذریعہ مجاہدات اور ریاضات کے
زائل کیا جائے گا۔ اسی قدر روح کی لطافت میں ترقی ہو گی اور لطافت کے
بڑھنے سے علوم میں یقیناً وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔ چونکہ انبیار اور اولیار
بھی ترک لذات اور کسر شہوات کے بعد جسمانی تعلقات سے بہت کچھ بیگانہ
ہو جاتے ہیں اس لئے اگر ان کو بہت سی وہ باتیں معلوم ہوں جو ہم کو نہ
ہوں تو یہ کوئی قابلِ استعجاب امر نہیں ہے اس کے بعد شیخ کہتا ہے۔

والعارفون المتنزهون
اذا وضع عنهم درن مقارنة
البدن وانفكوا عن الشواغل
خلصوا الى عالم القدس و
السعادة وانتقشوا بالكمال
الاعلى وحصلت لهم اللذة
العليا وقد عرفتها وليس
هذا الالتذاذ مفقوداً من
كل وجه والنفس فى البدن
بل المنغمسون فى تامل الجبروت

اور خدا کی معرفت رکھنے والے پاک بندے جس وقت
اُن سے جسمانی تعلق کا بار ہلکا کر دیا جاتا ہے اور
دنیوی مشاغل سے وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں، تو
ان کی توجہ خالص طور پر عالم اقدس اور عالم سعادت
کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے کمال
کے ساتھ موصوف اور بڑی لذت اٹھانے والے
ہوتے ہیں جیسا کہ تم پہلے معلوم کر چکے ہو۔ اور یہ
نہیں کہ جب روح بدن میں ہو تو وُہ اس لذت سے
بالکل محروم رہیں۔ بلکہ ایسے لوگ جو خدا کی عظمت و
جبروت کی فکر میں ڈوبے ہوئے اور جسمی مشغلوں

المعرضون عن الشواغل یعیبون
وهم فی هذه الابدان من
هذه اللذة حظا وافراً قد
یتمکن منهم فیشغلهم عن کل شی

اعراض کرنے والے ہیں وہ ان اجسام میں رہ
کر بھی اس لذت سے اتنا بڑا حصہ پالیتے ہیں جو
ان پر غالب آکر تمام اشیاء سے ان کو فارغ کر
دیتا ہے۔

شرح اشارات محقق طوسی میں ہے :۔

جل جناب الحق تعالیٰ ان یکون
شریعة لکل وارد او یطلع علیہ
الا واحد بعد واحد ولذالک
فان ما یشتمل علیہ هذا الفن
ضحکة للمغفل وعبرة للمحصل
فمن سمعہ فاشمأز عنہ
فلیتہم نفسہ لعلہا لا تناسبہ
وکلٌ میسّرٌ لما خلق لہ والمراد
ذکر قلة الواصلین الی الحق
والاشارة الی ان سبب انکار
الجمهور للفن المذکور فی
هذا النمط هو جهلهم بہا فان
الناس اعداء ما جهلوا والی
ان النوع من الکمال لیس مما

خدائے تعالیٰ کی جناب اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے
کہ ہر وارد اور صادر کی گذرگاہ بن جائے یا اس
پر مخصوص افراد کے سوا کوئی مطلع ہو سکے اور اسی
وجہ سے صوفیوں کا طریقہ غافل کے نزدیک مضحکہ خیز
اور طالب کے واسطے عبرت انگیز طریقہ ہے تو جو ان
کی باتوں کو سنکر ان سے اعراض کرے اُس کو
چاہیئے کہ وہ اس بارے میں اپنے نفس کا قصور سمجھے
کیونکہ اس کو ان سے مناسبت نہیں ہے۔ اور ہر
شخص کے واسطے وہی بات آسان ہوتی ہے جس
کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا
رسیدہ لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں اور اکثر لوگ
باطنی طریقوں سے اس بنا پر انکار کرتے ہیں کہ
وہ اس کو نہیں جانتے۔ آدمی ہمیشہ نامعلوم باتوں
کا دشمن ہوتا ہے۔ پھر یہ کمال ہر ایک کو محض

یحصل بالاکتساب المحض بل
انما یحتاج معذالک الی جوهر
مناسب لہ بحسب الفطرة[1]

حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا تا وقتیکہ اس
کا جوہر طبیعت فطرةً اس کے مناسب نہ
ہو۔

ان دونوں عبارتوں سے شیخ اور علامہ طوسی کا یہ مطلب ہے کہ اگر انبیاء اور اولیاء سے بعض ایسے امور منقول ہوں جو ہماری عقل کے دائرہ سے باہر ہیں تو ہم کو ان کی اس بنا پر تصدیق کرنا چاہیئے کہ ان کے نفوس بہیمیت کی ظلمات اور بشریت کی کدورت سے پاک و صاف ہوتے ہیں اور ہم کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن شیخ کی اس تقریر سے اس کا کوئی جواب نہیں نکلا کہ اس صورت میں ہندوستان کے جوگی، نصاریٰ کے راہب اور پہلے زمانہ کے اشراقیوں کے تمام علوم کیوں قابلِ تسلیم نہیں ہیں۔ جبکہ روحانیت کی ترقی کا مدار تجرد اور ترک دنیا پر ہو تو ان لوگوں کا تجرد انبیاء اور اولیاءٔ کے تجرد سے کیوں کم ہے۔ بلکہ بظاہر یہ لوگ بہت زیادہ آدمیوں کی مجالست سے متنفر اور انسانی جذبات کے فنا کر دینے والے نظر آتے ہیں۔ چونکہ اس حیثیت سے شیخ کی تقریر بالکل ناقص ہے اس لئے اب ہم شیخ کو چھوڑ کر دوسرے علماء کے اقوال کا مختصر انتخاب درج ذیل کرتے ہیں۔

○ قاضی ابن رشد اندلسی جس نے امام غزالیؒ کی کتابوں کا رد لکھا ہے اور اہل یورپ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی خیال کرتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتا ہے کہ خدائے برحق نے اپنی سچی کتاب میں ہم کو جا بجا قیاس اور استدلال

[1] شرح اشارات طوسی مطبوعہ مصر ص ۳۹۰۔ ۱۲

کے طریقہ پر توجہ دلائی ہے اور ہر چیز کو عقل سے دریافت کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے۔

واذا کانت هٰذه الشرائع حقادداعیة الی النظرالمودی الی معرفة الحق فانامعشر المسلمین لعلم علیٰ القطع ان لایودی النظر البرهانی الی مخالفة ماورد به الشرع فان الحق لایضاد الحق[1]

اور جب یہ شریعت سچی ہے اور لوگوں کو اس غور و فکر کی طرف بلا رہی ہے جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو تو ہم مسلمانوں کا قطعی یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ دلیل اور برہان سے شریعت کے خلاف کبھی ثابت نہیں ہو سکتا (کیونکہ شریعت بھی سچی ہے اور دلیل بھی سچی)، اور ایک سچی بات دوسری سچی بات کے مخالف نہیں ہو سکتی۔

دوسرے موقعہ پر صوفیوں کے روحانی طریقہ کا ذکر کرکے لکھا ہے:۔

ونحن نقول ان هٰذه الطریقة ان سلمنا وجودها فانها لیست عامة للناس بماهم ناس ولو کانت هٰذه الطریقة هی المقصودة بالناس لبطلت طریقة النظر ولکان وجودها بالناس عبثا والقراٰن کله انمادعا الی النظر والاعتبار وتنبیه علی طرق النظر[2]

ہم کہتے ہیں کہ اس طریقہ کے وجود سے اگرچہ ہم کو انکار نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ لوگوں میں عام نہیں ہو سکتا۔ پس اگر اسی طریقہ کا رواج پانا شریعت کا مقصود ہوتا تو فکر اور استدلال کا وجود بالکل باطل اور عبث قرار پاتا حالانکہ سارا قرآن قیاس اور استدلال کی طرف بلا رہا ہے اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کر رہا ہے۔

———

[1] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر ص۶

[2] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر ص۳۵

○ اس کے مقابلہ پر علامہ ابن تیمیہ رسالہ الفرقان میں لکھتے ہیں:۔

فمن جرّب مایقولونه (الانبیاء) ویقوله غیرهم وجد الصواب معهم والخطاء مع مخالفهم کماقال الرازی مع انه من انه من اعظم الناس طعناً فی الادلة السمعیة حتی ابتدع قولاً ماعرف به قائل مشهور غیره وهو انما تفید الیقین ومع هذا فانه یقول لقد تاملت الطرق الکلامیة والمناهج الفلسفیة فما رأیتها تشفی علیلا وتروی غلیلا وجدت اقرب الطرق طریقة القراٰن اقرأ فی الاثبات الیه یصعد الکلم الطیب الرحمٰن علی العرش استوٰی واقرأ فی النفی لیس کمثله شیٔ ولایحیطون به علمًا۔ ومن جرب مثل تجربتی عرف مثل معرفتی وایضًا فمن اعتبر ماعند الطوائف

تو جو شخص انبیاء علیہم السلام کے ارشادات اور لوگوں کے اقوال کا تجربہ کرے گا وہ یقیناً انبیاؑ کو حق پر اور ان کے مخالفوں کو خطا پر پائے گا دیکھو رازی جو سب سے زیادہ سمعی روایات کو غیر معتبر ٹھہرانے والے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ایک ایسی بات کہی جو اُن سے پہلے کسی نے بھی نہیں کہی تھی یعنی یہ کہ روایات سے کبھی یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اس رازی کو بھی یہ کہنا پڑا کہ میں نے فلسفہ اور علم کلام کے طریقوں میں بہت تامل کیا مگر ان کو ہرگز ایسا نہ پایا جو ایک مریض کو شفا بخشیں یا کسی پیاسے کو سیراب کر سکیں۔ ہاں تمام راستوں میں نزدیک تر راستہ قرآن کا ہے کہ ثبوت کی جانب میں ہم یہ آیتیں پڑھ لیتے ہیں الیه یصعد الکلم الطیب الرحمٰن علی العرش استوی اور نفی میں لیس کمثله شیٔ اور لایحیطون به علما۔ اور جو کوئی مجھ جیسا تجربہ کرے گا۔ وہ بھی میری طرح اس بات کو سمجھ سے گا۔ اور نیز جو شخص ان لوگوں کے اقوال میں غور کرے گا جنہوں نے انبیاء کی تعلیمات اور روایات سے

الذین لایعتصمون بتعلیم الانبیآء وارشادھم واخبارھم وجدھم کلّھم حائرین ضالین، شاکین مرتابین اوجاھلین جھلا مرکبًا[1]

استدلال نہیں کیا تو وہ ان کو تحیر۔ شک۔ گمرہی اور جہل مرکب میں مبتلا پائے گا۔

○ شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے جن الفاظ سے اپنے ایک خط میں امام فخر الدین رازی کو نصیحت فرمائی ہے وہ اس سے بھی زیادہ صاف اور کھلے ہوئے الفاظ ہیں۔ وہ امام رازی کی حمیت دینے کا شکریہ ادا کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ :-

فاذن ینبغی للعاقل ان یتعرض لنفحات الجود ولایبقیٰ ماسورًا فی قید نظرہ اوکسبہ فانّہ علی شبھۃٍ فی ذالک و لقد اخبرنی من الفت بہ من اخوانک ——— امنہ رآک وقد بکیت یومًا فسالک ھو ومن حضرہ عن بکائک فقلت مسئلۃ اعتقدتھا منذ ثلثین سنۃ فتبیّن لی الساعۃ بدلیل لاح لی ان الامر علی خلاف ما کان عندی فبکیت لعل الذی لاح لی ایضًا یکون مثل الاول فھٰذا قولک

اب عقلمند کے لئے مناسب ہے کہ وہ خدا کی جود و کرم کی خوشبوؤں سے فائدہ اٹھائے اور نظر و استدلال کی قید میں نہ پھنسا رہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ہمیشہ مشتبہ حالت میں رہتا ہے چنانچہ مجھ سے تمہارے ایک دوست نے جو مجھ سے ملا اس نے تم سے پوچھا تو تم نے یہ جواب دیا کہ ایک مسئلہ جس پر تیس برس سے اعتقاد جمائے ہوئے تھا۔ اسی وقت ایک دلیل سے مجھ کو کیا اطمینان ہے کہ جو تحقیق مجھ کو اب ظاہر ہوئی ہے۔ وہ بھی پہلے کی طرح غلط نہ ہوگی یہ خود تمہارا قول ہے اور

[1] دیکھو رسائل تیمیہ مطبوعہ مصر ص۱۰۹ - ۱۲

ومن المحال علی الواقف بمرتبۃ العقل والفکر ان یستریح وان یسکن ولا سیما فی معرفۃ اللہ تعالیٰ فما بالک یا اخی تبقی فی ھٰذہ الورطۃ ولا تدخل طریق الریاضات والمکاشفات والمجاھدات والخلوات التی شرعھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتناول ما نال من قال فیہ اللہ سبحانہ عبدًا من عبادنا اٰتیناہ رحمۃ من عندنا وعلمناہ من لدنا علمًا[1]

واقعی وہ شخص جو عقل اور استدلال کے مرتبہ سے آگے نہیں بڑھا ناممکن ہے کہ سکون و اطمینان اور راحت حاصل کرے بالخصوص خدا تعالیٰ کی معرفت میں تو اے برادر پھر بھی تم کیوں اس گرداب (نظر و فکر) میں پڑے ہوئے۔ اور کیوں ریاضات۔ مجاہدات۔ مکاشفات اور خلوات کا وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع کیا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم بھی وہ چیز حاصل کر لو جو اس بندے کی جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اس کو خاص اپنے پاس سے رحمت اور علم عطا کیا۔

○ حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں :-

بلکہ مقصود آنست کہ نسبت بمعتقدات یقینی واطمینانی حاصل کند کہ ہرگز بہ مشکک زائل نگردد بایراد شبہ باطل نہ شود۔ چہ پائے استدلال چوبین است ومستدل

یعنی مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنے اعتقادات میں ایسے مضبوط ہوں اور ایسا یقین اور اطمینان حاصل کریں جس کو کوئی شک ڈالنے والا زائل نہ کر سکے اور وہ کسی کے شبہات پیدا کرنے سے جاتا نہ رہے کیونکہ استدلال کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں اور مستدل ذرا سی دیر ہی

[1] دیکھو کشکول بہاؤ الدین عاملی مطبوعہ مصر ص۳۲۱ - ۱۲

ہے تمکین الابذکر اللّٰہ تطمئن القلوب[1]

نہیں ٹھہر سکتا خوب آگاہ ہوجاؤ کہ اللہ کے ذکر سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔

ایک اور موقع پہ ارشاد فرماتے ہیں :۔

" وچنانچہ طور عقل ورائے طور حس ست کہ انچہ بحس مدرک نہ شود عقل ادراک آں می نماید ہمچنیں طور نبوت ورائے طور عقل ست انچہ بعقل مدرک نشود بتوسل نبوت درک می آید وہرکہ ورائے طور عقل طریقے از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوۃ ست ومصادم بداہتہ[2] "

اور جیسا کہ عقل کا راستہ حواس کے راستہ سے علیحدہ ہے کہ جو چیز حواس سے نہ جانی جائے عقل سے معلوم ہوسکتی ہے اسی طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہے یعنی جس بات کو عقل سے دریافت نہیں کرسکتے اس کو نور نبوۃ سے جان سکتے ہیں اور جو شخص عقل کے اوپر کوئی اور طریقہ علم کا تسلیم نہیں کرتا وہ درحقیقت نبوۃ کا منکر اور بداہت کا مخالف ہے۔

ذرا اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

" وبالجملہ طریق ریاضت ومجاہدات دررنگ طریق نظر واستدلال وقتے اعتبار پیدا کند کہ مقرون بتصدیق انبیار بود۔ علیہم الصلوٰت والتسلیمات[3] "

اور حاصل یہ ہے کہ ریاضات اور مجاہدات کا طریقہ بھی نظر اور استدلال کے رنگ میں اس وقت قابل اعتبار اور اعتماد کے ہے جب کہ اس کی تصدیق انبیار علیہم الصلوٰت والسلام کے ذریعہ سے ہو چکی ہے۔

[1] دیکھو مکتوبات مجدد صاحب مطبوعہ دہلی ص۲۳۳ جلد ا۔ [2] ایضاً ص۱۰ جلد ۳۔ [3] ایضاً ص۲۲ جلد ۳۔

○ علامہ ابن خلدون بھی مجدد صاحب کے پورے پورے ہم زبان ہیں۔ وہ مجدد صاحب سے ذرا زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مقدمہ تاریخ میں تحریر کرتے ہیں :۔

" فاتّھم ادراکك ومدارکاتك فی الحصر واتّبع ما امرك الشارع من اعتقادك وعملك فھو احرص علی سعادتك واعلم بما ینفعك لانّہ من طور فوق ادراکك ومن نطاق اوسع من نطاق عقلك ولیس ذالك بقادح فی العقل ومدارکہ بل العقل میزان صحیح فاحکامہ یقینیة لاکذب فیھا۔ غیر انك لاتطمع ان تزن بہ امور التوحید والآخرة وحقیقة النبوّة وحقائق الصفات الالھیّة وکل ماوراء طورہ فان ذالك طمع فی محال ومثال ذالك مثال رجل رای المیزان الذی یوزن بہ الذھب فیطمع ان

پس تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصر کردینے میں خطا وار سمجھو (کہ جو ہم جانتے ہیں تمام موجودات اسی میں منحصر ہیں)، اور شارع علیہ السلام کے بتلائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے بہی خواہ اور سود و بہبود کو سمجھنے والے ہیں ان کا علم تمہارے علم سے اوپر اور ایسے ذریعہ سے حاصل ہونے والا ہے جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے باقی ہمارے اس کہنے سے عقل اور اس کی معلومات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہم عقل کو ایک میزان صحیح سمجھتے ہیں جس کے احکام یقینی اور جھوٹ سے پاک ہیں۔ ہاں یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس سے توحید و آخرة کے امور اور نبوت و صفات الٰہیہ وغیرہ کے حقائق کو وزن کرنے لگو یہ تو ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی شخص ایک سونے چاندی کے تولنے کا کانٹا دیکھے اور اس میں پہاڑوں کے تولنے کا ارادہ کرنے لگے۔ تو یہ نہ کہا جائے گا کہ ترازو وزن بتلانے

یزن به الجبال هذا الایدرك على ان المیزان فی احکامه غیر صادق لکن العقل یقف عنده ولا یتعدی طوره حتی یکون له ان یحیط بالله وبصفاته فانه ذرة من ذرات الوجود الحاصل منه وتفطن فی هذا الغلط من یقدم العقل على السمع فی امثال هذه القضایا وقصور فهمه واضمحلال رایه فقد تبین لك الحق من ذالك[1]۔

کے اعتبار سے درست نہیں ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ کہ ہرایک میزان کے واسطے ایک حد ہے جس کے آگے وہ کام نہیں دے سکتی اسی طرح میزان عقل بھی ایک خاص موقعہ پر ٹھہر جاتی ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات وصفات کا احاطہ کرے۔کیونکہ جو عقل بھی وجود کے ان ذرات میں کا ایک ذرہ ہے جو خدا کی طرف سے فائض ہوتے ہیں۔ اسی جگہ سے تم ان لوگوں کی غلطی کم فہمی اور رائے کی کمزوری کو معلوم کرلو جو عقل کو اس قسم کے معاملات میں سمعیات پر ترجیح دیتے ہیں۔

دوسرے مقام میں لکھتے ہیں :-

"وقد تنبه لذلك رئیسهم ابو علی ابن سینا فقال فی کتاب المبدأ والمعاد ان المعاد الروحانی واحواله مما یتوصل الیه بالبراهین العقلیة والمقائیس لانه على نسبة طبیعیة محفوظة ووتیرة واحدة۔ فلنا فی البراهین علیه

اور رئیس الفلاسفہ بو علی سینا نے بھی اس بات پر متنبہ ہوکر کتاب المبدأ والمعاد میں یہ کہہ دیا ہے کہ روح کو عذاب وثواب ہونے پر تو ہم دلائل اور قیاسات قائم کرسکتے ہیں کیونکہ ایسا ہونا مضبوط قانون طبعی اور ایک خاص طریقہ کے تحت میں داخل ہے تو اس کے اندر برہان سے ثابت کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر جسمانی اعادۃ اور جزا سزا کا محض استدلال

سعة واما المعاد الجسمانی و احواله فلا یمکن ادراکه بالبرهان لانه لیس على نسبة واحدة وقد بسطة لنا الشریعة الحقة المحمدیة فلینظر فیها ولیرجع فی احواله الیها[1]۔

سے جاننا ہرگز ممکن نہیں کیونکہ وہ کسی خاص نسبت اور قاعدے کے نیچے واقع نہیں ہے لیکن شریعت محمدیہ حقہ نے اس کی حالات تفصیل کے ساتھ بیان کردیئے ہیں جس کا جی چاہے اس کی طرف رجوع کرکے دیکھ لے۔

جو علوم نہ بذریعہ عقل کے بلکہ بذریعہ کشف کے معلوم ہوں ان کی بابت لکھتے ہیں :-

ثم هذا الکشف لا یکون صحیحا کاملا عندهم الا اذا کان ناشیا عن الاستقامة لان الکشف قد یحصل لصاحب الجوع والخلوة ———— کالسحرة والنصاری وغیرهم من المرتاضین ولیس مرادنا الا الکشف الناشی عن الاستقامة ومثاله ان المراٰة الصقیلة اذا کانت محدبة او مقعرة وحوذی بها جهة المرئ فانه یتشکل فیها معوجا على غیر صورة وان کانت مسطحة تشکل فیها المرئ صحیحا[2]۔

پھر یہ کشف بھی صحیح اور کامل اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ استقامۃ (یعنی شریعت کے احکام پر پورا پورا عمل نہ ہو) ورنہ یوں تو بہت سے ریاضت اور خلوت سے صفائی قلب حاصل کرنے والوں کو بھی کشف ہونے لگتا ہے جیسا کہ ساحرین۔نصاریٰ اور ریاضت کرنے والے اور ان دونوں کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک صاف آئینہ تو محدب اور مقعر (اونچا نیچا) ہو اس میں کسی چیز کا عکس بھی ٹیڑھا ترچھا پڑتا ہے اور ایک آئینہ مسطح (ہموار) ہو اس میں شکل بھی سیدھی اور صحیح صحیح دکھائی دے گی۔

○ حضرت شیخ شہاب الدین صاحب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔
"عقل اور استدلال کے طریقہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ایسا یقینی نہیں ہوتا جس کا ازالہ نہ ہو سکے"۔ تو گویا اس میں ایک قسم کا تردّد اور اضطراب رہتا ہے اور صوفیہ کرام کے علوم بالکل قطعی اور یقینی ہوتے ہیں۔ یعنی ناپائدار نہیں ہوتے۔ ان میں اگر کوئی شک وشبہ پیدا کرنا چاہے تو ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو ایسا ہے کہ گویا اپنی آنکھوں سے ایک چیز دیکھ لی اور اپنے کانوں سے کوئی بات سن لی چنانچہ عوارف میں لکھتے ہیں:۔

"فما اضطراب الطبائع الا نوعٌ من الجهل فقلوب الصوفية واعية لانهم زهدوا في الدنيا بعد ان احكموا اساس التقوى فبالتقوى زكت نفوسهم وبالزهد صفت قلوبهم فلما عدموا شواغل الدنيا بتحقيق الزهد انفتحت مسامُّ بواطنهم وسمعت آذان قلوبهم"[1]

تو یہ اضطراب اور تردّد جو طبیعتوں میں دیکھتے ہو یہ بھی جہل کی ایک قسم ہے۔ اس اعتبار سے صوفیوں کے قلوب بہت محفوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے تقویٰ اور طہارت کی بنیاد کو مضبوط کرکے زہد اور ترک دنیا اختیار کیا۔ تو تقویٰ کی وجہ سے ان کے نفس پاک اور زہد کی وجہ سے دل صاف ہو گئے۔ اور جب دنیوی مشاغل کو انہوں نے فنا کر دیا تو ان کے باطن کے مسامات کھل گئے اور اُن کے دل کے کان سننے لگے۔

○ متکلمین کی جماعت میں علامہ علاؤ الدین علی الطوسی (المتوفی ۸۸۷ھ) نے سلطان محمد فاتح کے حکم سے جو کتاب حکماء کے رد میں لکھی ہے۔ اس کے مقدمہ

[1] دیکھو عوارف المعارف مطبوعہ مصر ص۶ ۔ ۱۲

میں یہ بتلایا ہے کہ ہماری عقل بہت سی اشیاء کی حقیقت دریافت کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ بلکہ بڑے بڑے حکما محسوسات کی ماہیت معلوم کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں تو ہم کو چند ایسے امور کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے۔ جن کی باریکیوں کو اگرچہ ہم نے خود نہیں سمجھا مگر خدا کے ایسے سچے رسولوں نے ہم کو انکی خبر دی ہے جن کی صداقت پر سینکڑوں آیات بینات گواہی دے رہی ہیں

کیا ہماری آنکھوں نے ان تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جن کو وہ دیکھ سکتی ہیں یا ہمارے کانوں نے ان تمام آوازوں کو سن لیا ہے جن کو وہ سن سکتے ہیں (یا ہمارے ہاتھوں نے تمام اُن چیزوں کو چھو لیا ہے جن کو وہ چھو سکتے ہیں۔ یا ہماری زبان نے تمام ان الفاظ کو ادا کر دیا ہے جن کو ہم ادا کر سکتے ہیں) پھر جب ہمارے ان حواس اور ان قوتوں نے اپنے مقدورات پر پورا پورا احاطہ نہیں کیا تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے عقلی قوت کو اپنی ساری معلومات پر کامل تصرف اور قبضہ حاصل ہو جائے۔ یہاں تک کہ خدا کی ذات وصفات کے مسائل بھی اس کے قابو میں آجائیں اور حقائق اشیاء میں سے کوئی حقیقت ایسی نہ رہے جو اس کی دسترس سے اچھوتی ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پانی، آگ مٹی وغیرہ وہ اجسام جو ہر وقت ہم کو نظر آتے ہیں ان کی حقیقت کے دریافت کرنے میں بڑے بڑے فلاسفر متحیر ہیں۔ افلاطون کہتا ہے کہ یہ بسیط اجسام ہیں اور ارسطو کی جماعت کہتی ہے کہ نہیں ہیولی اور صورت سے مرکب ہیں جو۔ دیمقراطیس کہتا ہے کہ یہ اجسام ایسے ذرات سے مرکب ہیں جو نہایت سخت ہونے کی وجہ سے قابل تقسیم نہیں ہیں۔ پھر

اجزار جسم کے متناہی اور غیر متناہی ہونے کی حیثیت سے نظام کچھ کہتا ہے اور متکلمین کچھ۔ اسی طرح عقل اور نفس ناطقہ کے بارے میں ہر ایک کا مذہب جداگانہ ہے اور ایک جو دلیل قائم کرتا ہے دوسرا اس کو رد کر دیتا ہے۔ بھلا وُہ نفس جو ہر وقت ہمارے پاس رہتا ہے اور وُہ اجسام جو شب و روز ہمارے استعمال میں آتے ہیں جب اُن کی حقیقت معلوم کرنے میں ان افکیار کا یہ حال ہے تو غیب کے اسرار اور ملکوت کے دقائق تک ان کی رسائی کی کیونکر اُمید ہوسکتی ہے۔ سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال کی صحیح کیفیت کو وُہ ہی شخص سمجھے جس کی تائید خدا کی جانب سے کی گئی ہو۔ ایسا شخص اس کی اطلاع کرے جس کے مبعوث من اللہ ہونے پر ہزاروں علامات ظاہر ہو چکی ہوں ورنہ جو احمق نبوت کے انوار سے مستفید ہوئے بغیر محض اپنی عقل پر بھروسہ کرکے الٰہیات کی کُنہ تک پہنچنا چاہے گا اس کے اوہام یقیناً اس کی عقل سے سخت مزاحمت کریں گے اور اس کو وہمی اور عقلی چیزوں کے تمیز دینے میں ایسی دشواری پیش آئے گی۔ جس کے انسداد کی کوئی تدبیر اس کے پاس نہ ہوگی۔ ارسطو کا یہ قول نہایت انصاف پر مبنی ہے کہ الٰہیات کے مسائل میں دلائل سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

باقی جن حکمائے انبیار کی تقلید کو چھوڑ کر ان مسائل میں انہاک پیدا کیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو فطرۃً ذہین بنایا تھا اور ان کی عقلوں میں ایک قسم کی تیزی پیدا کی تھی۔ جس کے ذریعہ سے انہوں نے ہندسہ اور حساب وغیرہ علوم میں ایسی کامل دستگاہ پیدا کرلی، کہ اس

اعتبار سے ان کی جس قدر تعظیم کی جاتی تھوڑی تھی۔ لیکن افسوس انہوں نے خدا کے اس انعام کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اور وہ اس کے پورے پورے مصداق بن گئے۔ ع اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

انہوں نے ایسے لق و دق میدان میں قدم رکھنے کی جرأت کی کہ جو ان کی فہم و فراست کی سرحد سے بالکل خارج تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود بے راہ ہوئے اور اوروں کو گمراہ کیا۔

اب اُن کے اس حال سے ہر ایک انسان کو چاہیئے کہ عبرت حاصل کرے اور کسی ایسے رسول کے اقوال پر جس کی راست بازی دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہو بے چون و چرا اعتماد کرکے اپنے دل کو ان اضطرابات اور شکوک و اوہام سے رستگاری دے وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ [۱]

○ اب یہاں پہنچکر ہم کو چاہیئے تھا کہ ہم قلم کی باگ امام غزالیؒ کی تقریر کی طرف پھیر دیتے جس کا حوالہ ہم بہت دور سے دیتے چلے آرہے ہیں کیونکہ اس وقت ہم حکمار اور متکلمین۔ صوفیہ اور مورخین سب کے کلاموں کے انتخاب سے فارغ ہو چکے ہیں اور ہماری تحریر کے پڑھنے والوں میں جو تحریک اس مسئلہ کی بابت ہم پیدا کرنا چاہتے تھے وہ بھی غالباً پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن بڑی کوتاہی ہوگی اگر ہم اس پر موقع پر شاہ ولی اللہ صاحب جیسے یگانۂ عصر کو فراموش کر جائیں۔ ان کی نسبت مشہور ہے کہ متاخرین میں ان سے بڑھ کر کوئی اس مسئلہ (عقل و نقل) کا سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ اس اخیر

[۱] یہ سب تفصیل کتاب الذخیرہ مطبوعہ دائرۃ المعارف صفحہ ۲۰۹ میں مذکور ہے۔ ۱۲

دور میں ان سے زیادہ کسی نے شریعت کے اسرار اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے وہ اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

قد يظن ان الاحكام الشرعية غير متضمنة لشئ من المصالح وانه ليس بين الاعمال وبين ماجعل الله جزاءً لها مناسبة وان مثل التكليف بالشرائع كمثل سيد اراد ان يختبر طاعة عبده فامره برفع حجر اولمس شجر مما لا فائدة فيه غير الاختبار فلما اطاع او عصى جوزى بعمله وهذا ظن فاسد تكذبه السنة واجماع القرون المشهود لها بالخير[1]

کبھی یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ شریعت کے احکام عقلی مصالح پر مشتمل نہیں ہیں اور نہ اعمال میں اور انکی جزا و سزا میں کوئی خاص مناسبت ملحوظ ہے اور یہ کہ انسان کو خدا کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا ایسا ہے جیسا کوئی آقا اپنے غلام کی فرمانبرداری کا امتحان کرنا چاہے اور اس کو کسی پتھر کے اٹھا لانے یا کسی درخت کے چھونے یا کسی اور ایسے کام کا حکم کرے جس میں اس کی آزمائش کے سوا کوئی فائدہ نہ ہو اب اگر اس غلام نے اطاعت کی یا نہ کی تو اس کا ویسا ہی بدلہ دے دیا گیا۔ شریعت کی بابت یہ خیال بالکل فاسد ہے جس کی تکذیب سنت رسول اللہ اور قرون اولیٰ کے اجماع نے کی ہے۔

پھر ایک ورق کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں:۔

نعم كما اوجبت السنة هذه وانعقد عليه الاجماع فقد

ہاں جیسا کہ سنت اور اجماع سے یہ ثابت ہوا اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ خدا کی طرف سے محض

[1] دیکھو حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر ص۵ ۱۲۔

وجبت ايضًا ان نزول القضاء بالايجاب والتحريم سبب عظيم فى نفسه مع قطع النظر عن تلك المصالح لاثابة المطيع وعقاب العاصى وانه ليس الامر على ماظن من ان حسن الاعمال وقبحها بمعنى استحقاق الفاعل الثواب والعذاب عقليان من كل وجه وان الشرع وظيفة الاخبار عن خواص الاعمال على ما هى عليه دون انشاء الايجاب والتحريم بمنزلة طبيب يصف خواص الادوية وانواع المرض فانه ظن فاسد تمجه السنة بادى الرائ[1]

کسی چیز کے وجوب یا حرمت وغیرہ کے متعلق حکم کا نازل ہونا بھی مصالح عقلیہ سے قطع نظر کرکے نیکوں کو ثواب اور گنہگاروں کو عذاب دینے کا بڑا سبب ہے اور ایسا نہیں جیسا کہ بعضوں کا گمان ہے کہ اعمال کا حسن و قبح یعنی ان کے کرنے نہ کرنے پر عذاب و ثواب کا استحقاق محض عقل سے ثابت ہو سکتا ہو۔ باقی شریعت کا کام اس طبیب کی طرح جو دواؤں کے خواص اور مرض کے اقسام کو بیان کرتا ہے۔ صرف یہ ہو کہ وہ اعمال کی واقعی خاصیتوں کو ظاہر کر دے نہ یہ کہ وہ اپنی طرف سے کسی چیز کو واجب یا حرام بنائے۔ اس قسم کے خیالات بالکل فاسد ہیں۔ جن سے کھلے طور پر سنت رسول اللہ نفرت کرتی ہے۔

○ یہ تمام اقوال جو یہاں تک نقل کئے گئے ان مستند علماء کے اقوال ہیں جو بلحاظ اپنے فضل و کمال کے امت محمدیہ کے آفتاب اور ماہتاب شمار کئے گئے ہیں اور جن کی فضیلت خواہ کسی حیثیت سے ہو چار دانگ عالم میں تسلیم کی جا چکی ہے۔

لیکن ان متفرق اقوال اور پراگندہ مضامین سے ایک کم علم آدمی بجائے

[1] دیکھو حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر ص۶ ۱۲۔

اس کے کہ کچھ فائدہ اٹھائے سخت پریشانی میں پڑ جاتا ہے اور وہ متعین نہیں کرسکتا کہ میں ان میں سے کس بات کو لوں اور کس کو چھوڑوں، اسی تذبذب کے وقت میں امام غزالیؒ آتے ہیں اور احیاء العلوم وغیرہ کے ذریعے سے اس کی دستگیری کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں یہ سب باتیں درست ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کسی مذہب حق کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں اور یہ بھی ایک اعتبار سے صحیح ہے کہ نبوت اور ولایت کا مرتبہ عقل سے بالاتر ہے۔ یہ بھی غلط نہیں کہ ہر ایک علم عقل ہی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اس کہنے میں بھی کچھ حرج نہیں کہ بعض علوم عقل کے سوار اور کسی طریقے سے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کو بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ شریعت کے تمام احکام عقلی مصالح پر مبنی ہیں اور یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ محض عقلی مصالح کسی چیز کے فرض کرنے یا حرام کرنے کے لئے کافی نہیں۔

ممکن ہے کہ تمہاری کمزور طبیعت ان متضاد بیانات کو دیکھ کر گھبرا اٹھے اور تم ان پیچدار مقدمات کو کوئی منطقی طلسم سمجھنے لگو۔ مگر جو جامع مانع تقریر ہم عنقریب درج کریں گے اس کو پڑھ کر تمہاری تسلی ہو جائے گی۔ اور تم یقین کر لوگے کہ ان اقوال میں لفظی نزاع کے سوار کوئی حقیقی اختلاف سمجھنا ہمارے فہم کی تقصیر ہے۔

○ تم سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ انسان کو قدرت نے دوسرے حیوانات سے کون سی امتیازی حالت عطا کی ہے کیا قدرت۔ ارادہ۔ خوف۔ رجا۔ شہوۃ۔ غضب یہ صفات جو انسان میں رکھی ہوئی ہیں اور حیوانات میں نہیں

ہیں؟ یا آنکھ۔ ناک۔ کان۔ زبان۔ دست و پا جو اعضاء انسان کو عنایت کئے گئے ہیں اوروں کو نہیں دئے گئے؟ یا حس مشترک۔ خیال، وہم، حافظہ، وغیرہ حواس باطنہ جو انسان میں ودیعت کئے گئے ہیں، دوسروں کے حصہ میں نہیں آئے؟ تم یقیناً کہوگے کہ ان سب چیزوں کے اعتبار سے انسان کو کوئی فضیلت اور جانوروں پر حاصل نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات بعض جانور ان بعض قوتوں میں انسان سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو پھر وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان کی شرافت جانوروں کے مقابلہ میں تسلیم کر لی گئی۔ اور وہ کیا علامات ہیں جو انسان کے روشن چہرہ کے امتیازی خط و خال ہیں۔

اس کے جواب میں ہم بجز ان دو چیزوں کے کسی کا نام نہیں لے سکتے جن کا اختصار علم اور ارادہ کے دو چھوٹے چھوٹے لفظ کرتے ہیں، اور جن کی تشریح میں ہم کو اپنے ناظرین کے وقت کا ایک معتدبہ حصہ لینا پڑے گا۔ علم سے ہماری مراد وہ علم ہے کہ جس کی بدولت دنیا اور آخرۃ کے حالات منکشف ہوتے ہیں اور وہ کائنات کے حقائق کو ان کی اصلی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو۔ اور ارادہ کے لفظ سے ہم نے اس ارادہ کا قصد کیا ہے۔ جو نفسانی خواہش کے اشارہ پر نہیں بلکہ علم کے اشارہ پر چلنے والا ہے۔ کیونکہ جو ارادہ قوۃ شہوانی کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے وہ تو تمام حیوانات میں موجود ہے۔ ہر جاندار بھوک اور پیاس کے وقت دانہ پانی کی طلب میں دوڑتا ہے۔ شہوۃ کے غلبہ کے وقت اس کے فرو کرنے کا ارادہ کرتا ہے اپنے دشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت اور زور آزمائی دکھلاتا

ہے۔ تو کیا ان سب حالتوں میں ارادہ نہیں پایا گیا۔ لیکن ہاں وہ ارادہ نہیں جو افرادِ انسانی کی خصوصیات میں سے ہے انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شہوانی میلان کے خلاف بھی اگر اس کی عقل ہدایت کرے حرکت کر سکتا ہو، اور اپنے فعل و ترک میں جی چاہنے نہ چاہنے کا پابند نہ ہو۔

یہ ارادہ اور وہ علم جس کا ذکر پہلے ہُوا۔ بزرگ ترین مخلوقات یعنی انسان کے ساتھ مختص ہیں۔ اور ان ہی دو نشانیوں سے انسان حیوانات سے اور بڑا آدمی بچوں سے باعتبار اپنے کمال کے پہچانا جاتا ہے۔ بچہ جب اپنی پیدائش کے مدارج طے کرتا ہوا رحمِ مادر سے باہر آتا ہے تو وہ نہ بھلے بُرے، نیک و بد اور نافع مضر کی تمیز رکھتا ہے اور نہ اس کا کوئی ارادہ کسی قانونِ عقلی کا تابع ہوتا ہے۔ اور جوں جوں اس کے قویٰ میں نشوونما۔ اس کے علم میں ترقی اس کی معلومات میں وسعت ہوتی جاتی ہے اس قدر اس کے افعال و اعمال فہم و دانش کے قاعدوں میں منضبط ہوتے جاتے ہیں۔ اب اگر اس کا علم سچا ہے اور اس کی عقل نے جو فتوے نافذ کیے ہیں وہ صحیح ہیں تو اس کے سب عمل درست ہو سکتے ہیں۔ اور اگر اس کی عقل نے لغزش کھائی نافع کو مضر، مضر کو نافع یا نیک کو بد، بد کو نیک سمجھ لیا تو ہرگز توقع نہیں کہ وہ اپنی حرکات و سکنات میں کج روی و غلطی سے محفوظ رہے اس صورت میں ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ صحیح علم کے حاصل ہونے کے ذرائع سوچے اور تا بدست اپنے اندر اُن کے پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن جس حد تک غور کیا گیا علم کی حقیقت اس سے زیادہ معلوم نہیں

ہوئی کہ کسی چیز کا نقشہ ایسی طرح ہماری عقل میں کھنچ جائے جیسا کہ آئینے میں کسی شے کی تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ دیکھو اگر کوئی شخص ہماری نظر سے گزرا یا ایک شاندار مکان ہم نے کسی جگہ دیکھا اور کچھ دیر کے بعد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو پھر ہم جب کبھی اس شخص یا اس مکان کو دیکھتے ہیں۔ فوراً شناخت کر لیتے ہیں کہ یہ وہی شخص اور وہی مکان ہے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا نقشہ جو اس مکان یا اس شخص پر پورا پورا منطبق ہو موجود نہ ہوتا تو وہ اور کون سا معیار تھا جس کے ذریعہ سے اتنی مدت کے بعد ہم کو یہ شناخت ہو گئی۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کا ذہن (عقل) مثل ایک آئینہ کے ہے اور اس میں جو معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اس عکس کی مانند ہیں جو کسی شے کے محاذات کے وقت آئینہ میں دکھائی دیتا ہے۔ اتنا فرق ہے کہ آئینہ میں صرف ان اشیاء کا عکس پڑتا ہے۔ جو آنکھوں سے نظر آنے کے قابل ہوں اور ذہن میں ہر قسم کی چیزیں منقش ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کسی اسپیکر کی ایک لمبی چوڑی تقریر تم نے سُنی اور اس کے مضامین کا خلاصہ تم نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھا تو اب جب کبھی کوئی شخص وہ تقریر کرے گا۔ تم فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ بعینہٖ وہ مضامین ہیں جو فلاں اسپیکر نے بیان کئے تھے۔ اگر ان مضامین کا کوئی فوٹو تمہارے پاس نہیں تھا تو تم نے یہ کیسے جانا کہ وہ اور یہ تقریر ایک ہی ہیں۔ اس سے بدیہی طور پر معلوم ہُوا کہ ہمارے ذہن میں ان مضامین کا کوئی خاکہ موجود تھا۔ حالانکہ ان ہی مضامین کا عکس اگر ہم آئینہ میں لینا چاہیں تو بالکل

ناممکن ہے۔

غرض آئینہ میں اور ذہن میں اتنا تفاوت ہے کہ ایک میں مخصوص چیزوں کا عکس آتا ہے اور دوسرے میں ہر چیز کا مگر دونوں میں اس قدر اشتراک ہے کہ اس میں بھی کسی چیز کی تصویر حاصل ہوتی ہے اور اس میں بھی اب اگر کوئی چیز آئینہ میں منعکس ہونے کے قابل ہو لیکن منعکس نہ ہو تو جہاں تک تتبعؔ اور استقرار سے معلوم ہوا اس کے پانچ وجوہات ہو سکتے ہیں۔ یا یہ کہ وہ جوہر (لوہا) جس سے آئینہ بنتا ہے اس نے ابھی تک صقیل ہو کر آئینہ کی صورت اختیار نہیں کی یا آئینہ بن چکا۔ مگر زنگ آلود ہو گیا۔ یا صاف و شفاف ہے مگر جس چیز کا عکس اس میں لینا چاہتے ہو وہ اس کے مقابل نہیں۔ یا مقابل بھی ہے مگر آئینہ کے اور اس شے کے بیچ میں کوئی دوسری شے حائل ہے یا عکس لینے والے کو یہ معلوم نہیں کہ اس صورت کا عکس کس جہت میں ہو کر لیا جا سکتا ہے۔ ان سب حالتوں میں اشیاء مطلوبہ کا عکس آئینہ میں نہیں آسکتا۔ اور اگر ان موانع میں سے کوئی مانع موجود نہ ہو تو پھر محال ہے کہ محسوسات کی صورت اس میں ظاہر نہ ہو۔

ٹھیک اسی طرح انسان کے قلب (عقل) کی حالت ہے کبھی تو ایسا ہوگا کہ خود قلب ابھی ناقص ہے اور انعکاس کی پوری قابلیت اس میں پیدا نہیں ہوئی۔ جیسا کہ شیر خوار بچہ کا قلب کہ وہ معقولات کے علم سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ اور کبھی معاصی اور ناپاک افعال کے ارتکاب سے قلب پر ایک قسم کی کدورت اور ظلمت چھا جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی پوری جلا اور

صفائی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے اس میں لطیف اور باریک چیزوں کا انعکاس نہیں ہوتا۔ اور خدا کی ذات و صفات اور غیب کے اسرار سے یہ قلب بالکل ۔ری رہتا ہے۔

اس قلب کے زنگ چھوڑانے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ ہمہ تن ند کی اطاعت کی طرف توجہ اور مقتضائے شہوات سے پورا پورا اعراض کرے ۔ مجاہدات کا وہ طریقہ اختیار کرے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے ناجائز خواہشات کے استیصال کے واسطے تلقین کیا ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (القرآن) اور من عمل بما علم ورثہ اللہ علم ما لم یعلم (الحدیث) میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن کبھی آدمی کا قلب گناہوں کی آلائشوں سے پاک و صاف ہوتا ہے اور پھر بھی اس میں علوم ذات و صفات اور حقائق اشیاء مرتسم نہیں ہوتیں۔ ۔ کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی توجہ ان چیزوں کی طرف کامل نہیں ہوتی بلکہ وہ آفاتِ نفس کے جاننے یا طرق معاش کے مہیا کرنے میں مثلاً مصروف ہوتا ہے تو وہ چیزیں جن کی طرف اس کے قلب کو توجہ نہیں ہے۔ اسی طرح منعکس نہیں ہو سکتیں جس طرح آئینہ میں وہ صورتیں جو اس کے محاذی نہ ہوں۔ ہاں قلب کبھی صاف بھی ہوتا ہے اور توجہ بھی کامل ہے مگر وہ فاسد عقائد جو تقلید یا حسنِ ظن کی بناء پر دل میں پہلے سے راسخ ہیں حقائق کے انعکاس کے لئے حجاب بن جاتے ہیں اور جیسا کہ اور شئے مطلوب کے درمیان میں اگر کوئی شئے حائل ہو جائے تو اس کا عکس اس میں نہیں پڑتا

ایسے ہی حجاب کے وقت ہماری عقل حقیقی علوم کے حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے اور کبھی علم کے یہ تمام سامان جمع ہوتے ہیں مگر جن حاصل شدہ علوم پر یہ علم متفرع ہوتا ہے ان میں مناسب ترتیب قائم کرنی ہم کو نہیں آتی اس لئے ہم علم سے محروم رہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنی گدی کے پیچھے کا حال آئینہ میں دیکھنا چاہے۔ اب اگر وہ آئینہ کو آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے تو پیچھے کا حال اس میں کھل نہیں سکتا اور اگر پیچھے لیجاتا ہے تو گو انعکاس ہو جاتا ہے مگر آنکھیں اس عکس کو دیکھ نہیں سکتیں۔

اُس وقت یہ شخص باوجود تمام اسباب مہیا ہونے کے عکس کے دیکھنے سے اس لئے محروم ہے کہ اس کو اس عکس کے لینے کا طریقہ معلوم نہیں۔ اگر کوئی اس کو یہ بتلادے کہ ایک آئینہ پیچھے لیجاؤ اور ایک آئینہ اس آئینہ کے محاذات میں اس طرح سامنے رکھو کہ جو عکس اس آئینہ میں پڑے اسی عکس کا پرتوہ دوسرے آئینہ میں بھی آجائے تو اس طریقہ کے معلوم ہونے سے اس کی ساری مشکل حل ہو جائے گی۔ اور جو دقتیں اس عکس کے لینے میں وُہ اٹھا رہا تھا وہ یک لخت جاتی رہیں گی۔

یہی حال بعینہ انسان کے قلب کا سمجھو اور یقین کر لو کہ یہی امور ہیں جو اکثر حقائق کی معرفت سے ہم کو بے بہرہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ موانع نہ ہوں تو بیشک ہر قلب اس فیضِ علم کے حاصل کر لینے کی پوری قابلیت رکھتا ہے جو فیاض ازل کی طرف سے بغیر کسی بخل کے ہر وقت اور ہر آن جاری ہے۔

○ تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سچے مذہب کے احکام عقل کے مطابق ہوتے

ہیں ان کا یہ قول اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ ایک کامل اور صاف و شفاف عقل جس میں حقائق کے انعکاس کی سب شرائط موجود ہوں۔ ہرگز خدا کے حکم کے خلاف حکم نافذ نہیں کر سکتی اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ احکام خداوندی کو اپنی عقل کی میزان میں نہ تولو۔ ان کی غرض یہ ہے کہ ہماری زنگ آلود عقلوں میں خدائی اسرار کا انعکاس نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جس فریق کا یہ خیال ہے کہ حقائق نبوت اور حقائق صفات الٰہیہ ہماری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں وہ عام فہم اور ادراک کے لحاظ سے بالکل سچ کہتے ہیں اور جس شخص کا یہ قول ہے کہ نہیں یہ چیزیں بھی بذریعہ عقل انسانی کے دریافت ہو سکتی ہیں تو اس کا مدعی بھی غلط نہیں ہے۔ وہ بجا طور پہ عقل انسانی اسی کو قرار دیتا ہے جس میں نفسانی کدورتیں اور آلائشیں نہ ہوں۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ لوگ درجاتِ عقل کے موافق جنت میں جائیں گے اس پہ محمول ہے کہ حقیقی عقل کو جس قدر ترقی ہوگی جنت کے دروازوں سے قریب ہوتا جائے گا۔ اور یہ مقولہ کہ اکثر اہل جنت بے عقل ہوں گے۔ اس میں وہ لوگ مراد ہیں جو دنیا کی کاموں میں متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے ابلہ سمجھے جاتے ہیں اور علیکم بدین العجائز کا خطاب بھی انہیں سے ہے جن کے د۔۔ دقیق اسرار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

اب تم پھر ایک دفعہ ان متعارض اقوال کو یاد کرلو جن کے سلجھانے میں تم سخت پریشان تھے اور جن کی کوئی درست توجیہ تم سے بن نہ پڑتی تھی۔ اور اخیر میں امام صاحب کی اس زرین نصیحت کو خوب یاد رکھو۔

فلا غنا بالعقل عن السماع ولا
غنا بالسماع عن العقل فالداعی
الی محض التقلید مع عزل العقل
بالکلیۃ جاہل والمکتفی بمجرد العقل
عن انوار القرآن والسنۃ مغرور
فایاک ان تکون من الفریقین وکن
جامعا بین الاصلین فان العلوم العقلیۃ
کالاغذیۃ والعلوم الشرعیۃ
کالادویۃ والشخص المریض
یستضر بالغذاء متی فاتہ الدواء
فکذالک امراض القلوب لا یمکن
علاجہا الا بالادویۃ المستفادۃ
من الشریعۃ وھی وظائف العبادات
والاعمال التی رکبہا الانبیاء
صلوات اللہ علیہم لاصلاح القلوب
فمن لا یداوی قلبہ المریض بمعالجات
العبادۃ الشرعیۃ واکتفی بالعلوم
العقلیۃ استضربہا کما یستضر
المریض بالغذاء وظن من یظن

نہ عقل کو نقل سے استغنا اور نہ نقل عقل سے بے نیاز
ہے جیسا کہ عقل کو معزول کرکے محض تقلید کیطرف بلانے
والا جاہل ہے اسیطرح وہ شخص بھی دھوکہ میں ہے
جو قرآن و سنت کے انوار سے علیحدہ ہوکر صرف اپنی عقل
پر بھروسہ کرے تو تم کو ان دونوں گروہوں میں سے کسی
میں بھی داخل نہ ہونا چاہیئے بلکہ عقل و نقل کا جامع ہونا
چاہیئے۔ کیونکہ علوم عقلیہ عقل کی غذا اور علوم شرعیہ اسکی
دوائیں اور جو مریض دوا کا استعمال نہ کرے اسکو غذا
کے استعمال سے نقصان پہنچ جاتا ہے یہی حالت دلوں
کے امراض کی ہے کہ انکا علاج شرعی دواؤں سے
یعنی ان عبادات اور اعمال سے ہی ہوسکتا ہے جن کو
انبیاء علیہم السلام نے اس کام کیلئے ترکیب دیا ہے
پس جسکا دل بیمار ہو اور وہ طب شرعی کے بموجب اسکا
معالجہ بھی نہ کرے اور علوم عقلیہ کو اپنے حق میں کافی
سمجھے وہ اسی طرح ہلاک ہوگا جس طرح بیمار آدمی غذا
سے ہلاک ہوجاتا ہے۔ باقی جو لوگ سچے علوم عقلیہ کو
علوم شرعیہ کے خلاف تصور کرتے ہیں اور دونوں میں
تطبیق کو محال سمجھتے ہیں یہ ان کا خیال اس وجہ سے
ہے کہ انکی بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں۔

ان العلوم العقلیۃ مناقضۃ للعلوم الشرعیۃ وان الجمع بینہما غیر
ممکن ظن صادر عن عمی فی عین البصیرۃ
نعوذ باللہ منہ (خدا کی پناہ)۔

یہاں تک ہم نے امام غزالیؒ کی تقریر کا ماحصل نقل کردیا۔ امام صاحب کی
تقریر اگرچہ نہایت صاف نہایت سلیس۔ نہایت عام فہم اور نہایت پراسرار ہے
لیکن اس میں چند ایسے ادعائی مقدمات بھی ہیں جن کا انکار کردینا ہمارے ایک
بیباک حریف سے کچھ مستبعد نہیں ہے۔

ہم امام صاحب کے اس قابل قدر بیان کی بہت کچھ عزت کرسکتے ہیں لیکن
ہمارا ایک ظاہر پرست اور آزاد منش مقابل اس پر نکتہ چینی کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ
اگر ہم ذہن میں صورتوں کا انعکاس تسلیم کرلیں تو جو شرائط آئینہ میں انعکاس کیواسطے
قرار دی گئی ہیں ان سب کا ذہن میں پایا جانا کیوں ضروری ہے۔ یہ ہم نے مانا کہ ذہن
میں اور آئینہ میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے مگر ان دونوں میں تفاوت
بھی بے انتہا ہے جس کا اعتراف تم بھی پہلے کرچکے ہو۔ اب ان تفاوت کی بنا
پر بعض وہ شرطیں جو آئینہ میں ضروری ہیں حصول علم میں ضروری نہ ہوں یا اس کے
برعکس تو کیا مضائقہ ہے۔

اسکے سوا یہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اعمال بد کی مباشرت یا گناہوں کے
ارتکاب سے قلب پر کسی قسم کی تاریکی آجاتی ہے۔ اول تو ہم اعمال کی تقسیم نیک و
بد کی طرف تسلیم ہی نہیں کرتے۔ دوسرے معاصی میں ملوث ہونا بیشک قوت عملیہ
کے برائیوں سے یا فاسد ہونے کا نتیجہ ہے لیکن قوت عملیہ کا اس اثر بد سے متاثر

ہونا بظاہر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ نیز بقول قاضی ابن رشد اندلسی کے قرآن پاک نے
جا بجا قیاس اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کیا ہے اور خود بھی مختلف مواقع میں استدلال
سے کام لیا ہے۔ پس اگر شریعت کے احکام عقول عامہ سے بالاتر تھے تو قرآن نے
ہم سب کو عقل سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی طرف کیوں توجہ دلائی اور بقول معترض
کے ہر ایک انسان کو ایسے احکام کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا جو اس کی سمجھ سے
باہر تھے۔ حالانکہ انسان اپنے ذی عقل ہونے کی وجہ سے ہی تکلیف شرعی کا مستحق
ہوا ہے۔

یہ اور اس قسم کے اور شبہات ہیں جن کو سن کر ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے،
ہیں کہ، شعر

چو نشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست　　سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

اور بپاس خاطر معترض امام صاحب کے جادہ استدلال سے ہٹ کر
یا آگے بڑھ کر اس زبردست فاضل کی تقریر کی طرف رجوع کرتے ہیں جس
کی تصنیفات میں جتنا غور کر د اتنا ہی اس کی ذہنی دانشمندی اور صادق البیانی
کا اعتراف لازم ہے۔ یہ وہ فاضل ہے کہ جسکو اگر ہم اپنے عہد کا شیخ اکبر امام غزالی
اور شاہ ولی اللہ سب کچھ کہہ دیں تو بیجا نہیں۔ اور یہی وہ فاضل ہے جس نے
علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بنا ڈالی جو (انشاء اللہ) قیامت تک
کے واسطے پتھر کی لکیر ہے اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

اس فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ
علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج

کئے ہیں وہ اس مسئلہ عقل و نقل میں ہماری بہت زیادہ مشکل کشائی کرتے ہیں اور
اب ہم ذیل میں کچھ لکھیں گے وہ تمام تر انہی تصانیف سے ماخوذ ہوگا۔ شعر

مطرب ترانہ دگر از پردہ ساز کن　　زیرا کہ حرف عشق نمیدارد انتہا

○ صحیفہ عالم کا وسیع مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی روشن ہو چکی ہے کہ
(بقول طبیعیین کے فطرت نے اور بخیال اہل مذاہب کے) خدائے مختار نے دنیا
کی کوئی چیز بیکار نہیں بنائی اور جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے
ووں ووں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز کے منافع ہم پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لحاظ
سے کائنات کا ہر ہر جزو بیش قیمت حکمتوں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شے
کا تعلق کسی نہ کسی ایسی ایک یا چند اغراض سے بھی ہوتا ہے جنکی کمی زیادتی پر اس
شے کا کمال اور نقصان منحصر ہے اور جن کو ہم اس شئے کے اصلی اغراض کہہ سکتے ہیں
مثلاً حیوانات میں گھوڑے کی مدح و ذم اور اس کا حسن و قبح رفتار پر موقوف ہے
اگرچہ وہ گدھے کی طرح پالان بھی اٹھا سکتا ہے اور گائے بکری کی طرح اس کو
ذبح کر کے کھا بھی سکتے ہیں۔ اور اس کا دودھ بھی پی سکتے ہیں۔ لیکن یہ اس کے دودھ
کی افراط یا بدن کی فربہی۔ یا بار برداری کی طاقت اس کی قدر و قیمت میں اسی طرح
کچھ زیادہ دخیل نہیں جس طرح گائے اور بھینس میں چونکہ مقصود اعظم دودھ گھی وغیرہ
ہے اس لئے ان کی تیز رفتاری اور قدم بازی کا کوئی اثر ان کی بھلائی برائی پر نہیں پڑتا
یا گلاب کے پھول کی حسن و خوبی اس کے رنگ و خوشبو سے ہے۔ ذائقہ سے کچھ
بھی غرض نہیں ہوتی۔ یا آم کے ذائقہ سے سروکار ہے اس کے رنگ و خوشبو
سے چنداں تعرض نہیں کیا جاتا۔ ایسے ہی کتاب سے اگرچہ ہم کسی وقت تکیہ کا

کا کام لے سکتے ہیں۔ لیکن غرض اصلی اس سے پڑھنا ہی ہوتا ہے۔ یا ضرورت کے
وقت کپڑوں کو جلا کر کھانا پکا سکتے ہیں۔ مگر اہم مقصد ان سے یہی ہے کہ وہ آدمی کے
بدن کی پردہ پوشی اور زینت کا سبب بنیں۔

غرض عالم کے تمام اجزا پر نظر ڈالی جائے۔ ہر موقعہ پر یہی شان نظر آئے گی
پھر ناممکن ہے کہ انسان جو ہمیشہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کیا کرتا ہے
کسی ایسی غرض اعلیٰ اور مطلب اعظم سے خالی ہو جس کے ہونے نہ ہونے پر اس کی
بھلائی برائی موقوف ہو اور جس کے ذریعہ سے وہ مدح و ستائش یا ہجو و مذمت کا مستحق
سمجھا جائے۔

بیشک اس مقصد اعظم کے متعین کرنے میں ہم کو سخت دشواری پیش آئے گی
لیکن ہم اس عقدہ کو خود اعضائے انسان کی بناوٹ اور اس کے قویٰ کی ترکیب
سے حل کریں گے اور ہم یقین کرتے ہیں کہ خود انسان زبان حال سے اس مقصد کی
جستجو میں ہماری رہنمائی کرے گا۔

ہم جب اس معجون مرکب (انسان) کی اندرونی و بیرونی حالتوں میں غور کرتے
ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان پانچ چیزوں سے اس کی ترکیب عمل میں آئی ہے۔ عقل،
یعنی قوۃ علمیہ۔ شوق یا خوف۔ ارادہ اور اختیار۔ قدرت اور طاقت۔ ہاتھ پاؤں آنکھ ناک
وغیرہ اعضائے جسمانی چنانچہ جس قدر کام انسان کرتا ہے ان میں یہ پانچوں آلات اپنا
اپنا عمل کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک شخص شب کے وقت ایک جنگل میں چلا جا رہا ہے اس نے دور
سے اپنے راستہ پر کسی جانور کو دیکھا۔ جس کی نسبت کبھی تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ

یہ شیر ہے اور کبھی سمجھتا ہے کہ کوئی بیل کھڑا ہے۔ اب فطرۃ انسان کا پہلا کام یہ ہے
کہ وہ اپنے نفع اور ضرر کے پہلوؤں کو سوچے۔ اگر اس پر ضرر کا پہلو متعین ہو گیا یعنی
یہ کہ پھاڑ کھانے والا شیر ہے تو طبعاً اس پر ایک قسم کے خوف یا اجتناب کی کیفیت
طاری ہوگی اور اس کی قدرت اور طاقت تحریک میں آئے گی۔ اور اگر اعضا جسمانی
قابو میں ہوئے تو الٹے پاؤں وہاں سے بھاگنا شروع کر دے گا۔ اور اگر یہ شخص
اس جانور کو شیر نہ سمجھتا یا شیر سمجھ کر ایذا پہنچانے والی چیز نہ تصور کرتا تو برابر اپنے
شوق میں اُدھر بڑھتا چلا جاتا۔

اس سے یہ امر بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ شوق اور خوف۔ ارادہ اور اختیار
طاقت اور قدرت ہاتھ اور پاؤں وغیرہ (جن کے مجموعہ کو ہم قوت عملیہ سے تعبیر کرتے
ہیں) سب کے سب عقل یعنی قوت علمیہ کے محکوم اور زیر فرمان ہیں۔ اور جب عقل
مفرد (قوۃ علمیہ) کا کام نافع و مضر کی شناخت یا نیک و بد کی تمیز اور قوت عملیہ کا کام
حسب اشارہ عقل کسی عمل کا وجود میں لانا ٹھہرا تو اوّل کی حکومت اور دوسرے کی محکومی
کے لحاظ سے ان دونوں کے مجموعہ یعنی انسان کا کل کام یہ ہوا کہ وہ سوچ سمجھ کر مفید مشاغل
میں پڑے اور مضر کاموں سے بچے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ دنیا میں اعمال
کی تقسیم نیک و بد یا نافع و مضر کی طرف ہو سکتی ہو۔ کیونکہ اگر عملی دنیا سے بھلے
بُرے کا فرق بالکل اٹھا دیا جائے تو قوۃ علمیہ کے کارناموں کے لیے کوئی میدان ہاتھ
نہ آئے گا جیسا کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ قوۃ علمیہ صرف یہی کام کر سکتی ہے کہ مفید
اور بہتر کاموں کا ناقص اور مضر کاموں سے انتخاب کرتی رہے اور قوت عملیہ
کی اس کارگزاری کے لئے دو قسم کے اعمال کا اس کے سامنے پیش ہونا

ضروری ہے۔

اب چونکہ یہ ثابت ہوگیا کہ اعمال کی دو قسمیں کئے بغیر انسان کی خلقت ہی بیکار رہتی ہے تو اس کا بھی سراغ نکل آیا کہ تمام عالم ہمیشہ سے اس پر متفق کیوں ہے کہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں۔ نیک اور بد یا دوسرے الفاظ میں نافع اور مضر یہانتک کہ جو ملحد کسی مذہب کے قائل نہیں وہ بھی افعال و اعمال کی اس بدیہی تفریق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو کچھ گفتگو باقی ہے وہ صرف اس میں ہے کہ اعمال میں نیک و بد اور نافع و مضر کی تعیین کس طور پر کی جائے یعنی یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ فعل اچھا ہے یا برا۔ اس سے راحت پہنچے گی۔ اس سے تکلیف لیکن خوش قسمتی سے جو تقریر مرقوم ہوئی اس سے اس سوال کا جواب بھی کافی حد تک نکل آیا۔ کیونکہ جب عقل یا قوۃ علیہ اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ وہ بھلے اور برے یا مفید اور مضر اعمال میں امتیاز قایم کیا کرے۔ تو یقیناً قدرت نے اس میں اس امتیاز صحیح کا ملکہ ودیعت کیا ہوگا۔ اس وجہ سے یہی رائے مضبوط معلوم ہوتی ہے کہ عقل سلیم جس کام کا حکم کرے وہ نافع ہو اور جس سے وہ انکار یا گریز کرے اس میں کوئی مضرت ہو۔

یہاں سے اس کی بھی قوی امید ہوتی ہے کہ اگر خدا کی جانب سے بندوں کی ہدایت کے لئے کچھ احکام نازل ہوں (جن کے مجموعہ کو مذہب کہتے ہیں)، تو وہ بھی مو بمو عقل کے موافق ہوں ورنہ خدائے برتر کی دانائی اور متانت پر یہ الزام عائد ہوگا کہ اس نے عقل کو بھی ہمارے قویٰ پر حکومت عطا کی تاکہ وہ سب اس کے اشاروں پر کام کریں اور رسول کو بھی حاکم بنا کر بھیجا تاکہ اس کی اطاعت

کی جائے۔ اور ساتھ ہی دونوں کو متضاد بلکہ متناقض احکام بھی دیدیے؟ جن میں سے ایک کو قبول کرتے ہیں تو لازمی طور پر دوسرے سے سرتابی کرنی پڑتی ہے

غرض اب نہایت باوثوق طریقے سے یہ طے ہوگیا کہ سچا مذہب وہی ہے جو عقل سلیم کے مطابق ہو۔ اور بقول قاضی ابن رشد کے ہر اس شخص کو جس کے پاس عقل سلیم موجود ہے اپنے عقل سے کام لینا اور نظر و فکر کے صحیح طریقوں میں غور کرنا چاہیئے۔

اور بیشک تمام قرآن اور تمام احادیث کا یہی منشا ہے کہ وہ عقل کے دستور العمل کے موافق تعلیم دیں۔ اور ہر انسان کی عقل جب تک کہ وہ گرد و پیش کے خیالات سے متاثر نہ ہو اور جب تک کہ عقلی صحت کا زائل کر دینے والا کوئی مرض اس کو لاحق نہ ہو ان ہی سچے اعمال کی ہدایت کرے گی جن کے رواج دینے کے واسطے خدا کے صادق القول پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔

لیکن ان تمام مراحل کے بعد بھی ہم کو جس مرحلہ کا طے کرنا ہنوز باقی ہے وہ یہ ہے کہ عقل کے ساتھ سلیم کی قید بڑھانے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ بعض عقلیں غیر سلیم بھی ہوتی ہیں اور جب سلیم کے معنی تندرست کے قرار دیئے گئے ہیں تو غیر سلیم اس عقل کو کہیں گے جو مریض اور بیمار ہو۔

تو یہ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ تندرست و سلیم، عقل کونسی ہے اور بیمار کونسی۔ آیا عقل کو بھی کوئی مرض لگ سکتا ہے اور اگر بالفرض لگ سکتا ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟ اس کے واسطے طبیب کون ہے؟ اور اس کے مرض کی علامات کیا ہیں؟

صرف یہی استفسارات ہیں جو باقی رہ گئے۔ اور ان ہی کے حل ہو جانے پر اس بحث کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو ان سوالات کا جواب سننے سے پہلے چند مختصر امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

(۱) اوّل یہ کہ جو کام ایسے آلات کے ذریعہ سے کیا جائے جن میں احساس اور ادراک نہ ہو تو اس کام کا نفع نقصان اُن آلات کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس شخص سے تعلق رکھتا ہے جو ان آلات سے یہ کام لینے والا ہے مثلاً بڑھئی کے کام میں بسولہ آتا ہے اگر اس کی دھار جھڑ جائے یا لکھنے میں کاتب کے قلم کی نوک ٹوٹ جائے تو یہ سب بڑھئی اور کاتب کا نقصان سمجھا جائے گا بسولہ اور قلم کے حق میں نہ کوئی نفع متصور ہے نہ نقصان۔ کیونکہ نفع نقصان کا وجود درحقیقت راحت اور تکلیف سے وابستہ ہے اور راحت و تکلیف کو وہی اشیاء محسوس کر سکتے ہیں جن میں ادراک اور شعور ہو۔ بہر حال جب آلات کا نفع و ضرر اصل فاعل کا نفع و ضرر ٹھہرا تو قویٰ عملیہ کے کاموں میں جو کچھ نفع یا نقصان ہو گا وہ فی الواقع عقل اور روح کا ہو گا کیونکہ ادراک و شعور عقل و روح ہی کا خاصہ ہے اور سب قوتیں اس کے آگے بمنزلہ آلات کے ہیں جیسا کہ ہم ابھی تحقیق کر چکے ہیں۔

(۲) دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ قوۃ عقلیہ اور قوۃ عملیہ کے مابین قدرت نے کچھ ایسا مستحکم رابطہ پیدا کیا ہے کہ ان میں ہر ایک کے آثار دوسرے تک متعدی ہوتے ہیں۔ قوۃ عقلیہ کے جو آثار قوۃ عملیہ میں ظاہر ہوتے ہیں کچھ تو وہی ہیں جن کا تعلق صفت حکومت سے ہے یعنی تمام قویٰ عملیہ کا بمقتضائے محکومیت

عقل کے ایک اشارہ پر حرکت میں آجانا اور بعض آثار ایسے ہیں جن میں عقل کی اس حکومت کو کچھ بھی دخل نہیں۔ جیسے غصہ کے وقت چہرہ کا تمتمانا اور آنکھوں کا سرخ ہو جانا۔ یا خوف کے وقت جسم کا کانپنا اور رنگ کا اڑ جانا۔ ان حالتوں میں جب کسی اشتعال انگیز یا ہیبت ناک چیز کا ادراک عقل کو ہوا تو فوراً بلا ارادہ اور بلا اختیار غصہ یا خوف کے آثار جسم پر ظاہر ہو گئے۔ درآنحالیکہ حکومت کی حیثیت میں قصد اور اختیار کا پایا جانا ضروری تھا علیٰ ہذا القیاس قوۃ عملیہ کی طرف سے بھی جو اثر عقل و روح تک پہنچتا ہے دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہی بلحاظ محکومیت اور آلہ بننے کے قوۃ عملیہ کے تمام منافع اور مضار کا عقل کے واسطے ثابت ہونا دوسرے بعض کیفیات بدنی سے عقل و روح کا بے اختیار کلفت یا راحت اٹھانا چنانچہ میل کچیل اور بول و براز سے جو کچھ نفیس طبعوں کو کدورت یا بخار و درد سر وغیرہ میں کلفت یا بدن کی صفائی کی لذت اور عافیت میں راحت ہوتی ہے وہ سب اسی قسم میں داخل ہے۔ اب جانبین سے ان نہائی تعلقات۔ تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال کے سلسلہ کو دیکھ ہم کو قطعی طور پر یہ یقین ہو گیا کہ قوت عملیہ کے بعض اعمال قوۃ علمیہ (یا عقل یا روح) کے حق میں مفید اور بعض مضر ہونگے۔ اور کوئی ایک فعل بھی قوت عملیہ کا اس نفع و ضرر سے خالی نہ ہو گا۔

○ پس اگر کوئی ایسا کامل آدمی جس کی روح کی صحت اور عقل کی سلامتی، دلائل قویہ سے ثابت ہو چکی ہو اعمال کے حسن و قبح کے متعلق کچھ فتویٰ نافذ کرے اور ہم اپنی قوۃ عملیہ کی کارروائی اس کے خلاف پائیں تو ہم کو اطمینان کر لینا چاہیئے کہ ہماری قوۃ عملیہ مضرت یا بالفاظ دیگر مرض میں مبتلا ہے اور اسے تاثیر و تاثر کے

کے قانون کے موافق جو قوۃ عملیہ اور عقل کے درمیان ابھی ثابت ہو چکا ہے یہ کہنا پڑے گا کہ قوۃ عملیہ یعنی عقل بھی اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے بلکہ بیماری میں پھنسی ہوئی ہے کیونکہ اگر عقل تندرستی کی حالت میں ہوتی اور پوری قوۃ کے ساتھ صحیح احکام نافذ کرتی تو قوۃ عملیہ جو ہر طرح سے اس کی محکوم اور زبردست ہے ہرگز اس کی عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے بھی زیادہ ضعف اور اضمحلال عقل کا اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ وہ خود بھی کسی عمل کے فوائد یا نقصانات سے واقف ہو۔ اور شہوت کے غلبہ یا کسی نفع جزئی معجل سے متاثر ہو کر اپنے اصلی حکم کے خلاف قوت عملیہ سے عملدر آمد کرا دے۔ حتیٰ کہ عمل کی ممارست سے عقل ایسی پاگل بن جائے کہ اسی مرض کو صحت سمجھنے لگے۔ چنانچہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے حالات کا تتبع کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اکثر افراد اس قسم کے روحانی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

دور کیوں جاتے ہو۔ اپنے زمانہ ہی کا حال مشاہدہ کر لو کہ اکثر لوگ ایسی موٹی موٹی باتوں میں جن کے بھلے برے سے سب واقف ہیں۔ جان بوجھ کر خلاف عقل عملدرآمد رکھتے ہیں۔ اور خاص وہ امراض جو تپ دق کی طرح مریض کو بھی کم محسوس ہوتے ہیں ان کی تشخیص تو کوئی طبیب ہی کر سکے تو کر سکے۔ پھر اکثر ارداح کا یہ حال ہے کہ بچپن سے تا حیات ان علتوں میں گرفتار رہنے کی وجہ سے صحت کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوتیں۔ اور کینہ حسد۔ بخل۔ تکبر۔ خود پسندی وغیرہ امراض سے قطع نظر کر کے وہ عام امراض جن کو وبائی امراض کہنا چاہیئے نہایت کثرت سے وقوع میں آتے رہتے ہیں۔

جس قوم کو چاہے دیکھ لیجئے کہ شادی۔ غمی۔ اور سوائے ان کے اور معاملات میں بھی ایسی ایسی قیود اور رسوم قبیحہ کے پابند ہیں کہ جن کے نقصانات کا دل و جان سے اقرار کیا جاتا ہے اسی طرح ہر فرقہ ایک جُدا ہی عقائد پر دل جمائے بیٹھا ہے۔ اگر ان سارے فرقوں میں سے کسی ایک کو بھی حق پر قرار دیں تب بھی اکثر لوگ تو باطل پر ہی نکلیں گے۔

پھر اکثر اقوام کی بعض عادتیں ایسی خلاف عقل ہیں کہ جن کی قباحت تمام اہل مذاہب کے نزدیک مسلم ہے۔ ہندوستان کے رانگھڑ گوجر اور افغانستان کے کوہستانیوں اور عرب کے بدوؤں میں چوری قزاقی اس درجہ مروج ہوئی ہے کہ رواج کی رو سے ان کے خیال میں موجب طعن و تشنیع نہیں رہی۔ طوائف کی قوم میں زنا کی اس درجہ ترقی ہے کہ معیوب ہونے کے بجائے اس کو اپنا ہنر سمجھنے لگیں۔ بنیوں کی بزدلی اور بخل ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اور دوسری بعض قوموں میں شراب نوشی بے پردگی اور ترک ناموس کی یہ نوبت پہنچی ہے کہ اس کے نتائج بد برابر دیکھتے ہیں مگر زبان پر نہیں لاتے۔ غرض مختصر لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آدہ کا آدہ بگڑا ہوا ہے جس کی اصلاح کی توقع بھی بہت کم ہو سکتی ہے۔

ایسی ابتر حالت میں جبکہ کوئی عقل بھی (الا ماشاء اللہ) مرض سے خالی نہیں ہے مجدد صاحبؒ نے اگر یہ فرمایا کہ نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہے تو ہمارے نزدیک بہت بجا فرمایا۔ کیونکہ بیمار کی طبیعت بسا اوقات ایسی اشیاء کی طرف راغب ہو جاتی ہے جو اس کے لیے مضر ہیں اور ان چیزوں سے

نفرت کرتی ہے جو فی الواقع اس کو طبعاً مرغوب ہیں بخار والا اکثر کھانے سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اور دنبل کی کلن یا خارش کی نوچ میں انسان اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیار مائل ہوتا ہے۔ لیکن وہ نفرت اور یہ رغبت دونوں بے محل ہیں جس کا باعث یہ ہی مرض ہوا ہے۔

اب اگر مجدد صاحب یا اور کوئی عالم یہ حکم صادر فرمادیتے کہ مذہب مرغوبات عقل سلیم کے مجموعہ کا نام ہے (اور درحقیقت ہے بھی ایسا ہی) تو ان مریض عقلوں کے واسطے آزادی یعنی مطلق العنانی کا اچھا خاصہ بہانہ ہاتھ آجاتا اور وہ ہرگز تندرست اور بیمار عقل میں تفریق قائم نہ رکھتیں۔ جس سے دنیا میں ایک فساد عظیم برپا ہو جاتا اور ہدایت کے بجائے گمراہی پھیلتی۔

بہرحال جبکہ اس امر کا باور کر لینا بالکل آسان ہو گیا کہ اکثر انسانی عقلیں مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے اس پہ قادر نہیں ہیں کہ وہ تیقن اور اطمینان کے ساتھ تمام اخلاق و اعمال میں نیک کو بد سے اور مفید کو مضر سے تمیز دیکھیں تو ناچار اس بارے میں کسی ایسے طبیب حاذق کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار پایا جس کی رائے کبھی غلطی نہ کرتی ہو۔ جو اپنے مریضوں پر پورا پورا رحم کھانے کے علاوہ تمام دواؤں کے خواص اور اوزان سے واقف ہو جس کو مختلف دواؤں اور غذاؤں کی تاثیرات کے باریک سے باریک فرق معلوم ہوں اور جس کی نظر موسموں کے اختلاف اور روح کی تراکیب پہ کامل طور سے جاری ہو۔

لیکن ایسا طبیب اس حکیم علی الاطلاق کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ جس کے سہارے تمام عالم کی ہستی قائم ہے جس کی ذات ہر قسم کے عیوب اور امراض

سے پاک ہے اور جس کے وجود اور کمالات کو عنقریب ایک مستقل رسالہ میں ہم روشن دلائل سے ثابت کریں گے[1]۔

دنیا میں جس قدر ہادی آئے۔ جن مقدس بندوں نے اپنی نبوت کا سکہ جمایا جتنے سچے شریعتوں کے تبلیغ کرنے والے گزرے وہ سب کے سب اسی حکیم مطلق کے مطب کے نسخہ نویس اور تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اسی نورانی کالج کی اسناد فضیلت لوگوں کو دکھلائیں اور اسی حکیم برحق کے عطا کئے ہوئے اعزازی تمغے اور نشانات پیش کئے تاکہ اللہ کی مخلوق ماہر طبیبوں کو اشتہاری حکیموں سے جدا کر سکے۔ رہبر اور رہزن کے پہچاننے میں دھوکہ نہ لگے اور محافظوں کی جماعت پر لٹیروں کا اشتباہ نہ ہو۔

ہم جب نبوت کی ضرورت اور نبی کے تعین پر مبسوط بحث کریں گے اس وقت ان علامات کا تفصیلاً ذکر کریں گے جن سے کسی خاص شخص کی نسبت یہ دریافت ہو سکے کہ وہ خدائی مدرسہ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا میں حکیم علی الاطلاق کی نیابت کا واقعی مستحق ہے۔

مگر اس موقع پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف اتنا دکھانا چاہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کے فیوضات اخذ کرنے اور اس کے علوم و کمالات کا مظہر بننے کے واسطے انسان میں عادۃً کن شرائط کی ضرورت ہے یا بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے مدرسہ میں طب روحانی کا حصول کس استعداد پہ موقوف ہے۔

بلاشبہ اس قسم کے عمیق مباحث میں دخل دینے کا ہم کو کچھ استحقاق نہیں ہے اور جس وادی میں ہم قدم زن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کو بآسانی قطع

[1] یہ رسالہ "اسلام کے بنیادی عقائد" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

کر لینے کا خیال محض ہماری فکر کے خارج از حوصلہ بلند پروازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن اس ناواقف مسافر کو راستہ کی مشکلات کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے جس کی دستگیری کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مبصر اور تجربہ کار ہادی موجود ہو۔

ہم پہلے بھی جن تیرہ و تاریک راہوں کو طے کر کے اس مقام تک پہنچے ہیں ان میں کو گزرنا آسان نہ تھا اگر قاسمی تصنیفات ہمارے لیے مشعل راہ نہ ہوتیں اور اب بھی انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ ان ہی کی روشنی میں منزل پیش آمدہ کے مہالک خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم اپنے مقصد اعلیٰ پر صاف جا پہنچیں گے۔

وہ ذات بابرکات جس کی قوت قدسیہ نے شریعت صادقہ کے پیچ در پیچ اور نظری ور نظری اسرار کو بھی بداہت کی حدود کے قریب لا رکھا ہے۔ اگرچہ وہ خود دنیا سے اٹھ گئے مگر ان کی قیامت تک نہ مٹنے والی یادگاریں ہماری رہنمائی کے واسطے زندہ جاوید ہیں۔

اس میں ہرگز مبالغہ نہیں کہ اگر حضرت مولانا محمد قاسم (روحی وارواحکم فداہ) کی بیش بہا کتابوں پر میری دسترس نہ ہوتی تو میں ہرگز اس طرح کے نازک مسائل پر بے خوف و خطر قلم اٹھانے کی جرأت نہ کر سکتا۔ اس لئے یہ سخت احسان فراموشی اور خیانت متصور ہوگی کہ میں کسی ایسے مضمون کو اپنی طرف منسوب کر کے جو در حقیقت حضرت مولانا مرحوم کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہو اپنی غیر واقعی عظمت و تفوق کا ثبوت پیش کر دوں۔ میں اس سے زیادہ اپنے کو خوش قسمت اور فائز المرام بنانے کی تمنا نہیں رکھتا کہ مولانا کے عالی مضامین

میری پیرایہ بیان میں اس طرح ادا ہو جایا کریں کہ ان کی تعبیر میرے مدعا کے واسطے مفید اور صحیح ہو اور اپنے قصور فہم یا پریشانی تقریر کی وجہ سے دلائل کی تقریب ناتمام نہ رہے۔ چنانچہ اس وقت بھی جس بحث کا آغاز کیا جاتا ہے اس میں میرا صرف اسی قدر تصرف ہوگا۔

یہ بحث جس کی ابتداء سے آج ہماری تحریر کی دوبارہ ابتداء ہوئی ہے فی الحقیقت نبوۃ کی بحث ہے اور ہم کو ہٹ دھرمی اور ڈھینگا ڈھینگی سے نہیں بلکہ محض حق پژوہی اور انصاف کے ساتھ یہ دکھلانا ہے کہ وہ پر عظمت و جلال مفہوم جس کے لئے نبی رسول، پیغمبر وغیرہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔ کیا خارج میں واقعی طور پر اس کے کچھ افراد موجود ہیں یا وہ بھی منجملہ ان شاندار تخیلات کے ایک تخیل ہے جن کو ضعاف الوہم لوگوں کے دماغ فرصت اور تنہائی میں بیٹھ کر اختراع کرتے رہا کرتے ہیں۔

اس آخر احتمال کو سن کر جس سے شان نبوۃ میں سخت ملحدانہ گستاخی ہوتی ہے ہم کو اندیشہ ہے کہ شاید کوئی جوشیلے مسلمان ہمارے ایمان میں تردد پیدا کر کے ہم پر ہی نہ بگڑ بیٹھیں اسلئے ہم ایسے صاحبوں سے بادب عرض کرتے ہیں کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنے قابل تعریف غصہ اور جوش کو ہم مسلمان ناقلین کے حق میں صرف کریں بہتر ہو کہ ان مطلق العنان دہریوں کی سرکوبی کے واسطے استعمال فرمائیں جن کی زبان سے ما یھلکنا الا الدھر اور ان ھی الا حیاتنا الدنیا وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں نقل کئے گئے ہیں اور جن کی ایک بڑی بھاری تعداد آج کل یورپ میں زبان قال سے اور ہندوستان وغیرہ میں زبان حال سے یہ صدائیں لگا رہی ہے کہ خدا کا وجود محض ایک فرضی وجود ہے۔ نبوۃ و رسالہ صرع کی بیماری کے نام ہیں۔ اعجاز و

کرامات اگلے زمانہ کی نظربندیوں کے افسانے ہیں۔ اور وحی والہام کی حقیقت دیوانوں کی بڑسے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

یہ لوگ صرف ایک عقل کے اور وہ بھی اپنی عقل کے مشورہ کو ماننا چاہتے ہیں اور ان کے مذہب میں جادہ عقل سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنا کفر و شرک یا کم از کم گناہ کبیرہ کے برابر ہے۔

نیز ایسا شخص جس کو کبھی کسی مشکل مسئلہ کے متعلق افہام وتفہیم کا موقع ملا ہوگا بشرطیکہ اس کے بیوقوف مخاطب کے مسلمات بھی بہت ہی تھوڑے سے ہوں اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک ایسے آزاد فرقہ کی بے قید شبہات سے جس کا ذکر اوپر ہوا عہدہ برآ ہونا کس قدر دشوار مرحلہ ہے اور یہ کہ ہمارے مولانا نے روح دفداہ ابی وامی، نے ان لامذہبوں کے مقابلہ میں کس درجہ ثبات واستقلال اور معقولیت سے کام لیا ہے۔

مولانا کا اس آزاد گروہ سے صرف ایک سوال ہے وہ یہ کہ تمام مخلوقات میں نیک وبد کا تفاوت۔ بھلے برُے کا فرق اور اعلیٰ ادنیٰ کے امتیازی مدارج جو ہماری تمہاری سب کی عقل نے قائم کر رکھے ہیں اس کا معیار اور پیمانہ عقل کے پاس کیا ہے عقل نے جمادات سے حیوانات کو کیوں اچھا بتلایا ہے اور تمام حیوانات کے اعتبار سے انسان کو کیوں پسند نفیبت عطا کی ہے جہالت کے مقابلہ میں وہ علم کی ہمیشہ کیوں مداح رہا کرتی ہے۔ اور ہمت وشجاعت کے کارناموں کو وہ جبن ونامردی کے برخلاف کس وجہ سے سربلند رکھنا چاہتی ہے۔ المختصر وجود کو عدم پر وجودیات کو عدمیات پر ہونے کو نہ ہونے پر استغنا کو

احتیاج پر اور راحت کو تکلیف پر کیوں ترجیح دیتی ہے۔ وہ کونسا نمونہ اس کے پاس ہے جس کے ساتھ مناسب ومشابہ ہونے اور نہ ہونے کی وجہ سے وہ مخلوقات میں سے ہر ایک چیز کو بھلا یا برا بنادینے کا استحقاق رکھتی ہے۔

اگر تم ایک اچکن کا کپڑا کسی ہوشیار درزی کو قطع کرنے اور سینے کے لئے دو یا بازار جاکر کوئی عمدہ ٹوپی اور خوبصورت جوتی خریدنے کا ارادہ کرو۔ تو بیشک تم ان سب چیزوں کی حسن وخوبی اور موزونیت وغیر موزونیت کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھ سکو گے جو قدرت کی طرف سے تم کو ایسے ہی کاموں کے لیے عنایت ہوتی ہیں لیکن اس دیکھنے کے اندر تم کو چند پیمانوں پر ان اشیاء کے مطابق کرنے کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً اچکن کو تم اپنے بدن پر پہن کر اور جوتی کو پاؤں میں ڈال کر اور ٹوپی کو سر پر رکھ کر دیکھو گے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز اپنے پیمانہ پر پوری نہ اترے بلکہ ڈھیلی یا تنگ رہے تو تم اس کو ناموزوں سمجھ کر مسترد کردو گے اور اگر اتفاق سے کوئی چیز خاطر خواہ اپنے پیمانہ پر مطابق ہوگئی تو پھر خود خیال کرسکتے ہو کہ تم کہاں تک اس کی قدردانی کے لیے تیار ہوگئے۔

○ ٹھیک اسی طرح عقل کے پاس بھی ہر نیک وبد کی تمیز کا کوئی پیمانہ اور بھلے برے کی شناخت کا کوئی معیار موجود ہونا چاہیئے کہ جس پر منطبق ہونے اور نہ ہونے سے وہ ہر ایک مخلوق کے حسن وقبح کے مراتب دریافت کرسکے۔

غالباً ہر عقل کے جذبہ فطرت میں جیسا کہ ہم عنقریب ثابت کریں گے۔ مخلوقات کے ماسوا ایک ایسی اعلیٰ ہستی کا ادراک موجود ہے جو عین وجود ہونے کی وجہ سے عدم ونیستی کا شائبہ اپنے اندر نہیں رکھتی اور اسی وجہ سے وہ ہر قسم

کی احتیاجات سے بے نیاز ہے۔ وہ حی ہے۔ عالم ہے قادر ہے۔ متکلم ہے۔
ارادہ اور اختیار رکھتا ہے۔ غرض کہ تمام ہی عمدہ صفات کے جامع اور ہر طرح
کے عیب و قصور سے بری ہے۔

اب جس حد تک عقل اپنی رسائی اور صفائی کے موافق کسی مخلوق کو اس
ایک چیز سے مناسب پاتی ہے اسی حد تک اس کو اعلیٰ اور افضل جانتی ہے اور
جو چیز اس سے بعید المناسبۃ ہوتی ہے وتناہی عقل اس کو پستی کی جانب ڈھکیلتی
جاتی ہے مثلاً :-

وہ عقل کے مرتبہ شناسی کا معیار (جسکو دوسرے الفاظ میں ہم خدائی عزوجل
کہتے ہیں) چونکہ وجود ہی وجود ہے عدم کا اس میں اصلاً اختلاط نہیں اسی واسطے
ہماری عقل موجودات کو ہمیشہ معدومات پر ترجیح دیتی ہے۔ پھر موجودات میں
بھی جس شئے میں خدائی صفات کا کم و بیش ظہور دیکھتی ہے۔ اسی حیثیت سے
اس کی تفوق کو ان اشیاء کے مقابلہ میں تسلیم کرانے لگتی ہے جن میں وہ صفات
نہ پائے جاتے ہوں۔

دیکھو چونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ خداوند کریم زندہ ہے بیجان نہیں اور اس
باب میں ہم نے دیکھا کہ آدمی اور جانور خدا تعالیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں
مٹی۔ پانی۔ ہوا۔ آگ۔ شجر۔ حجر وغیرہ نہیں رکھتے تو ہم نے جان لیا کہ حیوانات کا
رتبہ جمادات سے اونچا ہے۔ اس کے بعد خیال کیا کہ خداوند کریم عالم ہے
جاہل نہیں اور ہر انسان باقی جانداروں سے علم و عقل میں ممتاز ہے تو ثابت ہوا
کہ انسان جملہ حیوانات میں اشرف و افضل ہے۔ پھر انسان بھی علم و اخلاق اور

احوال و اعمال میں متفاوت، اور کم و بیش ہیں تو جو کوئی علم میں زیادہ ہو اور اخلاق
مثل قدرت۔ سخاوت۔ حلم۔ عفو وغیرہ کے جو خدائے تعالیٰ کے اخلاق ہیں رکھتا
ہو وہ بلاشبہ اپنے اقران سے فائق شمار کیا جائے گا۔

بہرکیف جس چیز کو بھی عقل بھلا یا برا کہتی ہے اس کو ابتداءً یا بالآخر اسے
ایک نمونہ اور معیار پر مطابق کر کے دیکھتی ہے۔ البتہ چونکہ باہم عقلوں میں تیزی
اور صفائی اور توجہ کے اعتبار سے بے انتہا فرق ہے اسی لیے اس مطابقت
اور مناسبت کے معلوم کرنے میں بھی بے حد تفاوت ہونا چاہیئے۔

○ اب تم خیال کرو کہ دنیا کی سب چیزیں ارواح ہوں یا اجسام۔ اخلاق ہوں
یا اعمال، معانی ہوں یا الفاظ باوجودیکہ خدائے برتر سے ایک قسم کی مناسبت رکھتے
ہیں۔ کیونکہ سب کی اصل وہ ہی خالق بے نیاز ہے اور سب کا وجود اسی کے
وجود کا پرتو ہے۔ لیکن پھر بھی اس مناسبت میں مخلوقات کے اندر زمین و
آسمان کا تفاوت ہے۔

ارواح کو بسبب اپنی لطافت کے جو قرب و مناسبت جناب باری
عز اسمہٗ سے حاصل ہے وہ ہرگز اجسام کثیفہ کو نہیں اور اجسام میں بھی مثلاً
آگ ہوا سے لطیف ہے اور ہوا پانی سے اور پانی مٹی سے۔ تو اسی ترتیب سے
ان میں سے ہر ایک کو خدا تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ ایک طرح کا قرب و مناسبت
حاصل ہوگا۔ اور شاید اسی قرب و بعد کا اثر ہے کہ لطیف چیزوں سے باوجود
اس نزاکت کے وہ کارہائے نمایاں بن پڑتے ہیں کہ کثیف سے ہرگز نہیں ہو
سکتے برق ایک پلک جھپکنے میں آسمان سے زمین پر آتی اور پھر آسمان پر

اڑ جاتا ہے اور اس سرعتِ سیر و سفر میں پہاڑ بھی اگر سامنے آجائے تو اس کی بھی ذرہ برابر حقیقت نہیں سمجھتی۔ شعاعِ شمس و قمر کا یہ حال ہے کہ سرعتِ برق بھی اس کے سامنے گرد ہے کہاں زمین کہاں چوتھا آسمان۔ خیال کرتے ہوئے دیر لگتی ہے پر اس کو یہاں تک آتے دیر نہیں لگتی۔

علیٰ ہذا القیاس اپنی نگاہ کو دیکھ اور آوازوں کی تیزروی اور خیال و گمان کی رسائی کو سوچ جتنی لطافت بڑھتی جائے گی اسی قدر زور اور قدرت زیادہ ہوگی۔ جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لطیف چیزیں اپنے قرب و مناسبت کی بدولت خدا تعالیٰ کے فیضان کمالات سے وہ حصہ لیتی ہیں جو بعید المناسبتہ اشیاء کو نہیں مل سکتا۔ اور اس کی نظیر ظاہر میں بالکل اس طرح ہے کہ شمع کا نور اس کے آس پاس کی چیزوں کو بہت زیادہ منور کرتا ہے لیکن دور کی چیزیں اس سے اتنی روشن نہیں ہوتیں۔

پس اگر وہ اخلاق حمیدہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات بابرکات میں موجود ہیں قلیل کثیر کسی فرد بشر کے نصیب ہو جائیں تو بے شک بہ نسبت ان افراد کے جن میں یہ اخلاق نہیں اس شخص کو حق تعالیٰ سے بمقدار مطابقت اخلاق، کے قرب حاصل ہوگا۔ اور جو عنایات خاصہ خدائے کریم کی اس کے حال پر مبذول ہوں گی اوروں کو میسر نہ ہو سکیں گی۔

○ آپ عنقریب بوضاحت و تفصیل یہ معلوم کریں گے کہ جیسے زمین و آسمان میں چار طرف نور آفتاب کا ظہور ہے۔ اور اسی کے ذریعہ سے آپ سرخ و سفید کا امتیاز اور خوبصورت و بدصورت کا فرق قائم کرتے ہیں اور ہر صحن اور ہر روشندان

ہر جگہ اور ہر مکان میں جُدا جُدا قطع سے وہ ہی جلوہ گری کئے ہوئے ہے ایسے ہی تمام کائنات کا وجود خداوند حقیقی کے نور وجود کی پرتو افشانی کا نتیجہ ہے۔ تو جس طرح آفتاب عالمتاب کو باایں ہمہ عموم فیض۔ قلعی دار آئینہ اور آتشی شیشے کے ساتھ وہ خصوصیت خاصہ حاصل ہے کہ دوسرے اجسام کے ساتھ نہیں۔

(دیکھو۔ آتشی شیشے میں سوائے روشنی کے آفتاب کی جانب سے ایک خاص حرارت اور آتشی اثر کی بھی آمد ہے اور باقی اجسام کو جو دہیں اس کے پاس ہی رکھے ہوں اس تاثیر کی مطلق خبر نہیں۔ یا آئینہ قلعی دار میں آفتاب کی روشنی کا اس قدر اظہار ہے کہ در صورتیکہ دوسرے اجسام آفتاب سے فیضیاب ہو کر خود ہی روشن ہو جاتے ہیں یہ خود بھی سورج کی طرح چمک اٹھتا ہے اور جو اجسام اس کے بالمقابل ہوں ان پر بھی اپنا پرتو ڈالتا ہے۔)

اسی طرح فیض خداوندی کو بھی عام و خاص سمجھنا چاہیئے۔ کہ یہ فرق بجز فرق مناسبت اور فرق قابلیت کے اور کیا ہوگا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جیسے آفتاب کو آئینہ یا پتھر سب برابر و یکساں ہیں ایسے ہی خدائے بے نیاز کو بھی تمام مخلوقات برابر ہیں کسی سے بخل نہیں۔ البتہ مخلوقات کی قابلیت اور مناسبت بے انتہا مختلف ہے۔

تو جو لوگ صاف باطن ہیں اور اپنے بنی نوع سے ایسے ممتاز ہیں جیسے آئینہ لوہے سے یعنی جیسے آئینہ دراصل وہ ہی لوہا ہے جو میل کچیل کے دور ہو جانے کے باعث صاف و شفاف آئینہ بن گیا ہے ایسے ہی وہ لوگ بھی مثل

اور بنی آدم کے وہ ہی حقیقت اور روح انسانی رکھتے ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ ان کی ارواح بوجہ نہ ہونے آلائشوں اور کدورتوں کے جو بسبب تعلقات پنہانی کے ہوتی ہیں پاک و صاف ہیں وہ لوگ عجب نہیں کہ بہ نسبت اپنے بنی نوع کے زیادہ معزز و ممتاز ہوں اور بعضے ایسے فیض ان کو خدا کی طرف سے پہنچتے ہوں کہ ہم کو تم کو ان کی اطلاع بھی نہ ہو۔ یعنی ہم تم بذات خود ان فیوضات سے محروم رہیں۔ گو ان ہی پاک دل لوگوں کے واسطہ سے جن کے قلوب پر اوّل وہ فیض وارد ہوتے ہیں صرف اسقدر بہرہ یاب ہو جائیں جس قدر در و دیوار آئینہ منور سے یا سیاہ و سبز وغیرہ اشیاء جو جلنے کے قابل ہوں آتشی شیشے سے۔

غرض ہو سکتا ہے کہ جیسے آفتاب کے مقابلہ کے وقت آتشی شیشہ یا آئینہ قلعی دار کے باطن میں آفتاب کی طرف سے ایک فیض ایسی طرح آتا ہے کہ بظاہر آتا ہوا کچھ معلوم نہیں ہوتا اور پھر اس کے حاصل ہو جانے کے بعد وہ دونوں بھی بقدر طاقت اپنی فیض رسانی میں مطلق بخل و دریغ روا نہیں رکھتے بلکہ ہر اس چیز کو جو ان کے سامنے آتی ہے اپنے حلقۂ اثر میں داخل کرنے کے واسطے تیار رہتے ہیں۔

○ ایسے ہی کیا عجب ہے کہ بعض بنی آدم کے دلوں پر جن کے دل جسمانی کثافتوں اور نفسانی کدورتوں سے پاک و صاف ہیں ایسی حرارت محبت خداوندی نازل ہوتی ہو کہ اوروں کو اس کی خبر بھی نہ ہو اور وہ خود آتشی شیشے کی مانند اس کو پی جائیں اور تحمل کر جائیں لیکن دوسروں کے دلوں میں آگ رگا کر اور ان کی ساری کدورتوں کو سوخت کر کے ایسا پاک و صاف کر دیں جیسا

لوہے کو جلا کر صاف و شفاف آئینہ بنا لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس نور الٰہی سے جو مثل آئینہ کے خاص ان کے دلوں پر اترتا ہے اور اُترتا ہوا معلوم نہیں ہوتا اور ان کا ظاہر مثل در و دیوار کے اور باطن مثل اس آئینہ کے جو خود آفتاب کے مقابل نہ ہو مگر اس آئینہ کے مقابل ہو جو آفتاب کے مقابل ہے بکمال آب و تاب جگمگا اٹھے۔ یعنی ان کا فیض ان لوگوں کو جو ان کی طرف صدق دل سے متوجہ ہوتے ہیں ظاہر و باطن میں ایسا مالا مال کر دے کہ کدورت کا نام و نشان باقی نہ رکھے اور عمدہ اعمال اور برگزیدہ اخلاق سے ان کا اندرون و بیرون بخوبی آراستہ ہو جائے۔

ہماری خواہش اس وقت اپنے دوستوں سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدائے عزوجل میں (جو کہ مخزن کمالات ہے) اور چند انسانوں میں فقط ایک ایسے ہی خاص طرح کے تعلق کو مستبعد نہ سمجھیں جیسا کہ انہوں نے آتشی شیشے وغیرہ کا آفتاب کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔

اگر ان کو خالق و مخلوق کے درمیان اس قسم کے پوشیدہ تعلقات کے ممکن التسلیم ہونے میں تامل نہ رہا (اور غالباً نہ رہا ہوگا۔) تو پھر ہم بہت ہی تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اُن خصوصیات کو طے کر سکیں گے جن سے کسی ایک یا چند معین اشخاص کی صداقت پر جو کبھی اس تعلق کے مدعی رہے ہوں کافی استدلال ہو سکتا ہو۔ لیکن

○ ہم ابھی تک تو اسی ورطہ حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ مثلاً دوپہر کا وقت ہے آفتاب ٹھیک نصف النہار پر ہے۔ کنکریاں سنگریزے۔ درخت کی

شاخیں۔ زمین کے ریت سمندر کا پانی اور لوہے کے کالے کالے ٹکڑے غرض دنیا
کی سینکڑوں ہزاروں چیزیں اس کے سامنے پڑی ہوئی ہیں۔ سورج کی روشنی
میں ہر ایک شے ان میں سے الگ الگ دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر ایک میں دھوپ
کی کچھ نہ کچھ گرمی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن ان ہی مختلف الانواع اشیاء
کے بیچ میں اور ان ہی کالے سیاہ آہن پاروں کے قریب ایک شخص بیٹھا ہے
جس کے ایک ہاتھ میں آتشی شیشہ اور دوسرے میں کوئی سیاہ یا سبز چادر ہے
اور جب وہ اپنے شیشے کو سورج کے روبرو کر کے چادر کو اس کے مقابلہ پر لاتا
ہے تو اسی وقت چادر میں آگ سلگ کر دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ اور جب شیشے
کو سورج کے یا چادر کو شیشے کے سامنے سے سرکا دیتا ہے تو وہ تاثیر
آتشیں باقی نہیں رہتی۔

یہ سارا تعجب انگیز ماجرا جب ہم ایک انتہا سے انتہا جاہل اور متعصب
آدمی سے کہتے ہیں تو وہ بغیر کسی استعجاب کے اس کو تسلیم کرنے لگتا ہے
لیکن باوجود اس کے وہ بہت افسوس ناک بیباکی کے ساتھ محال سمجھ
کر تمسخر اڑانے کو جائز رکھتا ہے جب ہم اس سے یہ کہتے ہیں کہ ایک خشک
اور بے آب و گیاہ ریگستان میں جہاں پر بہت سے ایسے مختلف المذہب
مختلف الطبائع اور مختلف الالوان لوگ جمع تھے جن کے پتھریلے معبودوں
کی مانند سخت و سیاہ دلوں پر آفتاب کمالات کی شعاعیں بھی اپنا گہرا اثر
نہ ڈالتی تھیں۔ جن کے تہ بہ تہ مادی کثافتوں کے نیچے ان کی لطیف روحانیت
نے اپنے کو چھپا رکھا تھا۔ اور جن کی جہالت آمیز حرکتوں اور غافلانہ

بد مستیوں سے دنیا کی اخلاقی مرقع کی اصلی صورت ایسی بگڑ گئی تھی کہ پہچانی
نہ جا سکتی تھی۔

وہاں پر ایک ایسا صفا کیش اور روشن ضمیر انسان ظاہر ہوا جس کے
قلب میں فطری طور پر کمالات الہی سے استفادہ کرنے کی پوری استعداد
ودیعت کی گئی تھی۔ اور جس نے ہوش سنبھالتے ہی بغیر کسی ظاہری معلم کے
تمام گرد و پیش کے خیالات سے علیحدہ ہو کر ایسی روش اختیار کی جو سیدھے
معبود حقیقی تک پہنچانے والی تھی۔ اس پاکیزہ سرشت انسان کو اپنے
جبلی اخلاق اور برگزیدہ ملکات کی بدولت جو وہ بطن مادر سے اپنے ساتھ لایا
تھا۔ اس منبع الکمالات خالق سے ایک خاص الخاص نزدیکی اور مناسبت
قائم ہو گئی اور جس وقت وہ خدا کا پاک طینت بندہ تمام فانی تعلقات کو فراموش
کئے ہوئے دل سے طلب صادق کے ساتھ خدائے ذو الجلال کی جناب
میں متوجہ ہو کر بیٹھا تو نہ معلوم کس غیر محسوس راستے سے ایک ایسی گرم روشنی
اس کے قلب کی تہ میں اتری کہ پھر جو دل بھی سامنے آیا اس کی ساری
کدورتوں اور آلائشوں کو جلا کر کندن بنا دیا۔

کیا کوئی عقل و انصاف کا حامی ان دونوں واقعوں میں جو ہم نے ذکر
کئے مادیت اور روحانیت کے فرق کے سوا اور کوئی فرق ہم کو ایسا بتلا سکتا ہے
جس سے ایک واقعہ تو ہماری احمق مخاطب کے نزدیک قابل تسلیم ٹھیرا اور
دوسرے کی محال اور ناممکن سمجھ کر ہنسی اڑائی گئی۔

بلاشبہ آتشی شیشے اور آفتاب کی مثال ایک جسمانی مثال ہے جس

کو ہم کسی روحانی مسئلہ کے استدلال میں بقاعدہ منطق پیش نہیں کر سکتے لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ نہ ہم نے اس کو اپنا استدلال بنانا چاہا ہے اور نہ فی الحقیقت ہم کو بنانے کی ضرورت ہے۔

ہم اوائل تحریر میں تبلا چکے کہ ہماری غرض اصلی اس موقع پر صرف اس قدر ہے کہ آپ خدائے بزرگ کے اور اس کے بندوں کے مابین ایک ایسے مخصوص تعلق کے ممکن ہونے سے انکار نہ فرمائیں جس کے ساتھ حضرت رب العزت کے بعض افادات خاصہ وابستہ ہوں پس اگر آپ اس قسم کے تعلق کو ناممکن اور محال سمجھیں گے تو درحقیقت مدعی آپ ہوں گے اور استدلال وبرہان سے کسی بات کا ثابت کرنا بھی بحیثیت مدعی ہونے کے آپ ہی کا منصب ہوگا کیونکہ یہ بدیہی قاعدہ ہے کہ اگر کسی چیز کے وجود وعدم کے ہونے نہ ہونے کے متعلق نزاع ہو تو اس میں مدعی وجود کا ماننے والا سمجھا جاتا ہے اور بخلاف اس کے اگر گفتگو کسی چیز کے امکان وامتناع (ہو سکنے اور نہ ہو سکنے) میں ہے تو اب مدعی وہ شخص ہے جو اس کو ناممکن اور ممتنع سمجھے۔

اس اعتبار سے اگر میں بغیر کسی مزید توضیح کے یہ کہہ دیتا کہ بعض نبی آدم اور خدائے عزوجل میں بعض ایسے تعلقات ممکن ہیں جو اس کے اور بنی نوع میں نہ پائے جاتے ہوں، تو مجھ سے کسی قسم کے مطالبہ دلیل کا استحقاق نہ تھا، بلکہ مجھ کو حق تھا کہ میں اپنے ان مخالفوں سے جو ایسے تعلقات کو محال کہتے ہوں حجت طلب کروں، لیکن میں نے مناظرہ کے پہلو سے درگزر کر کے محض تقریب الی الفہم اور تسکین خاطر اور رفع اضطراب کے لیے ایک

محسوس ومشاہد نظیر بھی اپنے مدعا کی تبرعاً پیش کر دی تاکہ جو لوگ مادیات ومحسوسات کے دائرہ سے ایک قدم باہر نکالنے کے خوگر نہیں ہیں وہ بھی ان غیر محسوس تعلقات کی نوعیت سے فی الجملہ واقفیت حاصل کر سکیں۔

یہ ایک اتفاقی اور بہت ہی فائدہ مند بات ہوئی کہ جب ہم خالق ومخلوق کی ان پنہانی تعلقات پر بحث کر رہے تھے اور نظیروں اور مثالوں کے ذریعہ سے ان کو دلنشین کرتے جاتے تھے تو اس کے ضمن میں ہم کو چند ایسے اصول واسباب کے سراغ لگانے کا بھی موقع مل گیا جن پر یہ تعلقات واقع میں متفرع ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے یہ جان لیا کہ ان تعلقات خاصہ کی بنا اس قرب ومناسبت پر ہے جو کسی انسان کو خدا تعالیٰ سے اپنی روحی لطافت میں کامل ہو اخلاق حمیدہ سے متصف ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص ان اعلیٰ اوصاف کے ساتھ موصوف راستی کا حامی اور کمینہ اخلاق وذمائم سے محترز ہوگا اس کو بعید نہیں کہ بسبب قرب روحانی کے خدائے عزوجل کی جانب سے اندرونی طور پر اس قسم کے افاضات خاصہ ہوتے ہوں، جو اس کے دوسرے بنی نوع کو نہ ہوں۔ خدائے اقدس نے اپنے کمالات کا اس کو آئینہ بنا لیا ہو اور اسی شان مرآتیت کی وجہ سے اس کے دل میں خدا تعالیٰ کے نہایت غامض اور دقیق مافی الضمیر بھی منعکس ہو جاتے ہیں۔

اگر فرض کرو کہ ہم کو دنیا میں کسی معتبر ذریعہ سے ایسے ایک یا چار آدمیوں کے وجود کا پتہ لگ گیا جن میں یہ صفات اعلیٰ اور اکمل حیثیت کے اندر پائے جائیں تو یقیناً یہی لوگ ہماری ان بیمار عقلوں کے درد کا درمان بن سکیں گے

جن کے مرض کا مفصل تذکرہ ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں اور جن کی نسبت ہم نے کہا تھا کہ وہ مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے اپنے نیک و بد اور نافع و مضر میں اسی طرح صحیح تفریق نہیں کر سکتے جس طرح ایک بیمار آدمی بخار کی وجہ سے عمدہ عمدہ کھانوں کو برا سمجھنے لگتا ہے جو اس کو طبعاً مرغوب ہیں اور دنبل کی گھن یا خارش کی نوچ میں اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کی نوچنے پر بے اختیار مائل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ حالت صحت میں اس حرکت کو ہرگز عزیز نہیں رکھتا تھا۔

یہ اس خدائے بے نیاز کا بہت بڑا احسان ہے کہ میں نے جس مقصد کے ثابت کرنے کے واسطے چلنا شروع کیا تھا یہاں پہنچ کر میں نے اس کو پا لیا اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے آغاز سے انجام تک حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

(۱) افعال انسانی میں نیک و بد کی تقسیم ہر فرد بشر کو خواہ وہ کوئی مذہبی آدمی ہو یا دہری ماننا ضروری ہے۔

(۲) عقل سلیم جس کام کو اچھا یا برا بتلائے وہ ویسا ہی ہوتا ہے اور شریعت کے احکام بھی عقل سلیم کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۳) عقل اور قوۃ عملیہ میں ایسا رابطۂ خاص ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے اور حرکات ناشائستہ اور افعال ذمیمہ کا کسی شخص سے سرزد ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس کی قوت علمیہ (عقل) مریض یا کمزور ہے۔

(۴) عقل سقیم (مریض) جس شے کو نافع یا مضر بتلائے اس پر اطمینان

نہیں ہو سکتا اس بارہ میں عقل سلیم درکار ہے۔

(۵) ہر ایک چیز کے حسن و قبح سے کما حقہٗ خدا تعالیٰ ہی واقف ہو سکتا ہے۔ یا وہ شخص جس کو خدا تعالیٰ محض اپنے فضل و عنایت سے جس حد تک واقف کر دے۔

(۶) خدا تعالیٰ کے فیوض و عنایات خاصہ سے ہر ایک انسان بقدر اپنے قرب و مناسبت کے مستفید ہوتا ہے۔

(۷) جس قدر کوئی عقل لطیف یعنی نفسانی الائشوں اور مادی کثافتوں سے پاک و صاف ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق کے ساتھ مزین ہو گی اسی قدر اس کو خدائے عزوجل سے قرب و تعلق حاصل ہوگا اور ایسی ہی عقلوں کو ہم عقول سلیمہ کے نام سے یاد کرنے کے مستحق ہوں گے۔

ان صاف و صریح مگر مہتم بالشان نتائج کے سمجھ لینے کے بعد صرف یہ ہی نفع نہیں ہوا کہ ہم اپنے ایک خاص مقصد میں بقدر ضرورت کامیاب ہو گئے بلکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پر جو کچھ نکتہ چینیاں پہلے کی گئیں تھیں ان میں سے اکثر کا جواب بھی ضمناً اسی بیان سے نکل آیا۔ چنانچہ جن ناظرین کو امام ممدوح کی تقریر اور اس کے متعلق شبہات یاد ہونگے وہ خود ہماری پوری تقریر پر مکرر نظر ڈال کر امید ہے کہ ہر ایک شبہ کا جواب دریافت کر لیں گے

○ البتہ سرسید کے اس اعتراض کا کوئی جواب ہماری مضمون میں ابھی تک نہیں آیا کہ جب عموماً لوگوں کی عقلیں مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے صحیح و فاسد اور نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتیں اور نہ وہ ہر ایک بھلے برے کے

پہچاننے کے واسطے کافی ہیں تو ہمکو خدا تعالیٰ کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا حالانکہ انسان اپنے ذیعقل ہونے ہی کی وجہ سے تمام حیوانات کے برخلاف شرعیات کا مخاطب قرار دیا گیا ہے۔

اس کا جواب مختصراً تو صرف اتنا ہی ہے کہ شریعت نے جن چیزوں کے سمجھنے یا کرنے کی جس حد تک تکلیف دی ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے احاطۂ قدرت سے خارج نہیں ہے اور ہمارے ذی عقل ہونے اور اپنے ابنائے جنس سے ممتاز بننے کا یہ نفع کافی ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر مطلع ہو کر اپنے جملہ ارادات اور حرکات و سکنات کی باگ ان دونوں کے ہاتھ میں دیدیں۔ اور اجمالاً یہ جان لیں کہ جن دونوں کی صداقت کا ہم کو یقین ہو چکا ہے وہ بلاشبہ ہمارے کامل خیر خواہ اور کامل حکمت والے ہیں۔ اور ان کی ہر ایک چھوٹی سی چھوٹی تعلیم پر کاربند ہونا ہمارے لئے فلاح و سود مندی سے خالی نہیں ہے۔

اگرچہ ہم ان کل احکام کی یا ان میں سے بعض کی تفصیلی حکمتوں اور مصالح پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک ماہر ڈاکٹر جب کسی دوا یا غذا کے متعلق مفید یا مضر ہونے کا فتویٰ دیتا ہے تو ہم خواہ اس چیز کے خواص و کیفیات بلکہ نام سے بھی صحیح اور پر آشنا نہ ہوں اور خواہ جس کے استعمال کا وہ حکم دیتا ہے اس سے نفرت اور جس سے وہ منع کرتا ہے اس کی طرف رغبت بھی ہو مگر ڈاکٹر کی تجربہ کاری اور بہی خواہی پر اعتماد کر کے جس کو ہم نے محض ایک کمزور اور ضعیف گمان کے ساتھ تسلیم کر رکھا ہے۔ ہم اس دوا یا غذا

کے استعمال کی نسبت اپنا سابق رویہ بدل ڈالتے ہیں اور اس تبدیلی کے وقت بیچاری عقل کی ایک بھی نہیں سنتے بلکہ یوں تاویل کر کے تسلی کر لیتے ہیں کہ عاقلوں کی پیروی بھی درحقیقت عقل کی ہی پیروی ہے تو اس حیثیت سے گویا ہم نے عقل کے اشارہ کے بغیر کوئی جنبش نہیں کی۔

یہ ہی حال بعینہ مذہب و شریعت کا ہے۔ لیکن ہم کو تعجب کے ساتھ افسوس ہوتا ہے کہ سر سیّد نے ایک نرالی منطق سے اور عجیب گول مول الفاظ میں لوگوں کے دلوں سے ہمارے اس صحیح خیال کو مٹانا یا کم از کم سست کر دینا چاہا ہے جس جگہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارا یہ اصول نہایت جنچا ہوا ہے کہ انسان، صرف بسبب عقل کے جو اسمیں ہے مکلّف ہوا ہے پس جس بات پر وہ مکلّف ہوگا ضرور ہے کہ فہم انسانی سے خارج نہ ہو ورنہ معلول کا وجود بغیر علّت کے لازم آتا ہے جو محال و ممتنع ہے پس جن اخلاق کے پکڑنے اور چھوڑنے پر انسان مکلف ہے وہ ضرور عقل انسانی سے خارج نہیں"

(تہذیب الاخلاق جلد دوم مطبوعہ لاہور۔ مضمون کانشنس ص۱۲۳)

میرا یہ سوال سر سید سے ہے کہ جس عقل کو وہ تکلیف شرعی کے واسطے علت قرار دیتے ہیں اس سے کیا مراد ہے۔ آیا فقط قوۃ ادراک کا انسان میں موجود ہونا یا اس سے ہر ہر چیز کو تفصیلاً جاننا۔ اگر پہلی صورت اختیار کی جائے تو بعض احکام و اخلاق کے فوائد و علل پر مطلع نہ ہونے سے علت و معلول

میں جدائی کس طرح لازم آئی اور اگر خدانخواستہ سرسید نے دوسری شق کو لیا ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا کہ جو علت تکلیف کی سرسید نے قرار دی ہے وہ صحیح ہے اور آپ حیرت کریں گے جب یہ سنیں گے کہ میں اس شق کو تسلیم نہیں کرتا خود سرسید بھی اس کے اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی مضمون کے دوسرے حصہ میں وہ لکھتے ہیں۔

اس بیان سے جو نہایت بالکل سیدھا اور صاف ہے اور کچھ اور پیچ اس میں کچھ نہیں ہے اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ کانشنس فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے اور نہ وہ کسی مذہب کا اصل اصول قرار پانے کے لائق ہے اور نہ وہ فی حد ذات رہنما ہونے کے مستحق ہے۔ ہاں بلاشبہ سچے اصول پر انسان کی طبیعت تربیت پا جائے یا سچے خیالات سے اس کی طبیعت موثر ہو جاوے اور طبیعت سچائی کے مطابق حالت پیدا کر لے تب وہ حالت طبیعت یعنی کانشنس انسان کا رہنما ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:- (ایضاً تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۶۱)

ہاں یہ سچ ہے کہ قانون قدرت پر غور اور فکر کرنے سے وہ صحیح اخلاق جو انسان کی طبیعت کو ایسی حالت پر کر دیں جو کبھی دھوکہ نہ دے دریافت کر سکتے ہیں مگر کب جب کہ انسان کی معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور ان مختلف قویٰ کے اوپر جو اس کے بانی نے انسان میں رکھے ہیں ایک معتد بہ آگاہی

حاصل ہو تمام انسان ان رتائق پر نہیں پہنچ سکتے اور جو پہنچ سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہو سکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں در صدیوں میں پس اس لئے تاکہ اس قادر مطلق کی حکمت بیکار نہ رہے ضرور ہوا ہے کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کی حالت کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جنمیں خلقی ایسا مادہ دیا گیا ہو اور جو اعتبار اپنی فطرت کے ان سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہو۔"
ایضاً ص ۱۲۲

ان دراز عبارتوں سے بھی اور ان کے اور بعض تصریحات سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ جملہ احکام شرعیہ کے لم اور علت کو سمجھ لینا گو مطلق عقل انسانی سے خارج نہیں ہے۔ لیکن ہر عقل شخصی کا یہ منصب بھی نہیں کہ ہر ایک حکم کی حقیقت اور کنہ کے سمجھ لینے کا وہ دعویٰ کر بیٹھے۔ تو سرسید کے اصول کے موافق سوال یہ ہے کہ سوائے ان معدودے چند انسانوں کے جو دقائق شریعت سے خبردار ہوں (جیسا کہ سرسید بزعم خود تھے) اور لوگوں کو جو ایسے نہیں ہیں مکلف بنانا کیوں کر صحیح ہوا حالانکہ جن باتوں کے کرنے یا چھوڑنے پر ان کو برانگیختہ کیا جاتا ہے وہ ان کی عقل شخصی سے یقیناً خارج ہیں۔

پس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہم گزارش ہوا ڈھونڈیں اور رہنمایا عقل ادراک ان ارباب عقول سلیمہ کو جن کے کچھ کچھ اوصاف ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اطبائے روحانی سمجھ کر اپنے لئے کم از کم اسی طرح موت دائمی اور ہلاکت ابدی سے نجات دلانے والا تصور کر لیں جیسا کہ ایک جاہل بیمار جو بغرض تدادی

کسی طبیب حاذق کے آستانہ پر حاضر ہو کر اس کی نسبت خیال رکھتا ہے اور جس طرح ایک دیہاتی مریض اپنے معالج ڈاکٹر کے کہنے سے فقط اس اعتماد پر کہ وہ اس کے خواص اور منافع و مضار سے کما حقہ آگاہ ہوگا۔ کونین کے (یا کسی نامعلوم الاسم دوا کے) کھانے کے لیے بلا پس و پیش آمادہ ہو جاتا ہے (حالانکہ ذاتی طور پر وہ اس سے کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتا) ٹھیک اسی طرح ارباب عقول سقیمہ کو لازم ہے کہ وہ ارباب عقول سلیمہ کے احکام کے سامنے بالکل گردن ڈالدیں اور ان نسخہ جات کے استعمال کرنے اور پرہیز کے قایم رکھنے میں جن کا ارباب عقول سلیمہ نے امر فرمایا ہو ایک لمحہ کے لئے بھی توقف۔ تردد اور تنگدلی کو دخل نہ دیں بشرطیکہ طبیب کے طبیب اور ان نسخہ جات کے بامر طبیب ہونے میں ان کو کوئی شبہ باقی نہ رہ گیا ہو۔

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک	پس قسم ہے تیرے پروردگار کی کہ یہ لوگ ایمان سے ہرگز بہرہ
فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا	یاب نہیں ہوسکتے تاوقتیکہ تم کو (اے پیغمبر) اپنے باہمی
فی انفسھم حرجا مما قضیت و	منازعات میں حکم نہ ٹھہرادیں۔ اور تمہارے فیصلہ کے سامنے بغیر
یسلموا تسلیما۔	کسی قسم کی دل تنگی کے گردن تسلیم نہ خم کردیں۔

○ ممکن ہے کہ یہ سوال اٹھایا جاوے کہ جب ارباب عقول سقیمہ کو محض اپنے عقلوں اعتماد کرنا اور ان کی ہدایات اور احکام پر چلنا ہی روا نہیں رہا اور نہ کسی شرعی معاملہ میں ان کے اقتضاآت عقلیہ کی توثیق و تصویب ضرورۃً قرار دیے گئے تو آخر اس کے باور کر لینے کی ہی ہمارے پاس کیا ضمانت ہے کہ عقل سلیم و سقیم کے امتیاز اور طبیب و مریض کی تشخیص اور معالج و مستعلج

کی جستجو میں وہ ہی مریض عقلیں صحت و استقامت کے ساتھ ضرور کامیاب ہو جائیں گی اور اس کا احتمال باقی نہ رہے گا کہ جس شخص کو انہوں نے تندرست شمار کیا ہے وہ فی الحقیقت بیمار ہو اور جس کو اپنا نجات دہندہ طبیب سمجھے ہیں وہ ایک نا اہل اور خطرہ جان ہلاکو ہو۔

لیکن ایسا سوال پیش کرنے والوں کو تھوڑی دیر کے واسطے اس پر غور کرنا چاہیئے کہ اگر کسی اجنبی بستی میں کوئی اجنبی طبیب آجائے اور وہاں کے لوگوں سے اپنے فن کی حیثیت میں تعارف پیدا کرانا چاہے (حالانکہ وہ لوگ نہ تو نظریات طب سے خبردار ہیں اور نہ انواع مرض سے واقفیت رکھتے ہیں اور نہ ان کے لئے طرق علاج کی صحت و غلطی کا دریافت کرنا آسان کام ہے) تو ایسی صورت میں اس طبیب کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں؟

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ سب سے پہلے تو وہ مجامع و مجالس میں موقع بموقع اپنے طب دانی کا تذکرہ کرے گا۔ اپنے مطب پر ایک بڑا سا سائین بورڈ لگائے گا۔ اور وقتاً فوقتاً اپنے اسانید کو جو کسی معتبر مدرسہ سے اس کو دستیاب ہوئے ہونگے خواص کے روبرو پیش کرتا رہے گا اور اس کے بعد کچھ لوگ تو عام چرچا اور محض شہرت پر ایمان لاکر اور کچھ محض امتحان اور جانچ کرنے کی نیت سے اور کچھ طبیبوں کے احوال و اطوار سے قدرے واقفیت رکھنے کی وجہ سے اس کے پاس بعوض معالجہ آنے لگیں گے اور بہت سے مریضوں کے پاس اپنا اعتبار بڑھانے اور مطب کو چمکانے

کے لیے وہ بذات خود بغیر کسی قسم کی فیس اور مالی معاوضہ کے دور دراز کے تعلقات
جتلا کر چلا جائے گا۔

اب اس ساری جد و جہد اور دوا دوش میں اگر کچھ بیماروں کی شفا اس کے
ہاتھ سے مقدر ہے تو وہ اس کی اولین کامیابی کا باعث ہوگی۔ اور جوں جوں کہ
یہ سلسلہ ترقی کرتا جائے گا اسی قدر اس کی عزت اور مقبولیت کو چار چاند لگتے
جائیں گے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ کچھ زمانہ کے بعد شہرت عامہ کے اس درجہ پر پہنچ
جائے گا کہ مریضوں کو اس کے یہاں پہنچنے کے لئے استدلال اور غور و فکر کی ضرورت
باقی نہ رہیگی اور عوام کے محاورات میں شفاء و صحت تو اس کے معالجانہ
کوششوں کی طرف اور موت و ہلاکت خالی بخت و اتفاق یا مشیت ایزدی
کی طرف منسوب ہونے لگے گی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دوسرے سے
طبیبوں کی مقبولیت کا معیار ہی اب اس کی تسلیم و تصدیق قرار پا جائیں گے۔

بعینہ اسی پر اطبائے روحانی (انبیاء علیہم والصلوٰۃ والسلام) کے حالات
کو قیاس کرو جب وہ عالم کی ہدایت و اصلاح کے لئے معبوث ہوتے ہیں
تو سب سے اوّل وہ اپنے من اللہ بشیر و نذیر ہوتے کا نہایت زور
شور اور تحدی کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اپنی دعوت و تبلیغ کا غلغلہ
اہل و عیال اور خویش و اقارب سے شروع کرکے مشارق و مغارب میں ڈال
دیتے ہیں۔ جس کو سن کر کچھ لوگ تو ان کے سابق چالیس سالہ زہد و ریاضت
پاک وصاف اخلاق۔ دیانت و راستبازی اعراض عن المال والجاہ شرافت
حسب و نسب اور روشن خوارق یا آیات بینات وغیرہ امور کی وجہ سے اور

بہت سے محض از راہ امتحان و تفتیش ہی فطرۃً ان کی طرف متوجہ ہو جاتے
ہیں۔ اور بہت سے وہ خوش قسمت ہیں کہ خود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی
قوت قلبیہ اور ہمت باطنی کے زور سے باذن اللہ ان کو اپنی طرف جذب کر لیتے
ہیں اور اسی اثنائے میں جب یہ لوگ روحانی امراض سے یکایک شفایاب ہونے
لگتے ہیں اور ان کے دلوں کی تاریکی دور ہو کر جمال خداوندی کا عکس ان میں
پڑنے لگتا ہے تو وہ اپنے ہادی کی نسبت فوراً چلا اٹھتے ہیں کہ:۔

مَا هٰذَا بَشَرًا إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ

اس وقت ان مریضوں کو بھلا چنگا دیکھ کر اور ان کے حالات سابقہ میں ایسا
انقلاب عظیم پاکر اوروں کے دل بھی للچانے لگتے ہیں اور ان کو ان کی صحت کی
بحالی پر رشک آنے لگتا ہے پھر تو مخلوق خدا فوج در فوج اور جوق در جوق ہو کر
اس پاک بندے کے گرد جمع ہو جاتی ہے اور اپنے اپنے امراض کا مرافعہ اس
کی طرف کرتی ہے۔ اور جیسے جیسے کہ یہ سلسلہ وسیع ہوتا جاتا ہے اندھوں کی
آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور غافلوں کو عبرت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آتا رہتا
ہے اس کے بعد اس کے طبیب حاذق (یا نبی مرسل)، سمجھنے کے واسطے نہ کسی
استدلال کی ضرورت رہتی ہے اور نہ اس میں بہت زیادہ تدقیق اور غور و غوص
کو کام فرمانے کی۔

○ الغرض جس وقت طبیب حاذق (نبی) کی شناخت کے لئے انسان کو
اپنے دماغ پر کچھ زور ڈالنے کی ضرورت تھی اس وقت تو چند قدرتی اسباب کی
بنا پر یہ شناخت بغیر زور ڈالے ہی حاصل ہوگی اور جب کہ اس کے حذاقت

کے نتائج متمثل ہو کر گویا آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گئے ہیں تو اس بحث
میں کد و کاوش کی مطلقاً حاجت ہی باقی نہیں رہی ہر شخص ان محسوس و مشاہد
نتائج کو دیکھ کر اسی طرح اس کے طبیب حاذق (نبی) ہونے کا یقین کر سکتا
ہے جیسا کہ کسی گھر کے صحن میں دھوپ نکلی ہوئی دیکھ کر آسمان پر آفتاب
کے نکلنے کا۔

اور اس بدیہی بلکہ اجلی البدیہیات کے سمجھنے کے واسطے انسان میں
ذرا سی عقل بھی خواہ وہ کتنی ہی علیل کیوں نہ ہو کفایت کرتی ہے۔ بشرطیکہ وہ
اس سے کام لینے کی کوشش کرے اور حق کے دیکھنے سے جو اس کو چھپنا چاہتا
ہے بالکل آنکھیں بند نہ کرے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں ارباب عقول
سقیمہ سے یہ مطلب ہمارا ہرگز نہیں ہے کہ ان میں کسی موٹی اور روشن سی
روشن بات کے سمجھنے کی بھی قابلیت باقی نہ رہی ہو اور محسوسات کی ادراک
کی استعداد بھی ان سے سلب کر لی گئی ہو۔

تم خود خیال کرو کہ کسی تجربہ کار طبیب کے ہاتھ پر تپ کہنہ کے پانچ
چار مریض (جو زندگانی سے مایوس ہو چکے ہوں، شفایاب ہو جائیں تو گھر گھر میں
اس کا چرچا پھیل جاتا ہے اور دور دراز شہروں کے مایوس العلاج بیمار اس کی
طرف رجوع کرنے لگتے ہیں اب اگر فرض کرو کہ ایک الطبیب کے دستِ شفا
سے کوئی بستی کی بستی یا ملک کا ملک تپ کہنہ سے صحت یاب ہو جائے تو
اس کی طرف لوگوں کی توجہ کیا کسی منطقی استدلال کے محتاج رہے گی۔

○ مثلاً سرخیل اطبائے روحانی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و جیسا کہ ہم نے

اپنے رسالہ الاسلام[1] میں نہایت مفصل بیان کیا ہے اور یہاں پر مصلحتاً ہم اپنے
زمانہ کے ایک (اصطلاحی) روشن خیال مؤلف کے الفاظ میں لکھتے ہیں) ایک
ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جبکہ دنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں
تھی۔ اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا
اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمہ کی گئی جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور
باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بداخلاق اور نفاق اور جنگ
جوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی
قوت نے ان پر ایسی عجیب و غریب تاثیر کی کہ اس سے ان کی تمام ظاہری و باطنی
حالتیں بدل گئیں برسوں کے بہکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے
سوتے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے جو مشرک تھے وہ موحد ہو گئے جو
کافر تھے ایمان لائے جو بت پرست تھے وہ بت شکن بن گئے جو گمراہ تھے وہ خدائی
راہ دکھانے لگے۔ جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا۔
خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں دماغ غرور و نخوت سے خالی ہو
گئے اور ان کے دل صبر و توکل۔ حلم و بردباری۔ زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی
صفات سے بھر گئے۔ آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست
پاک طبیعت راستباز نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا۔ جن کی کوششوں سے
شرک و بت پرستی کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی بند ہو
گئی اور اس کے بدلے ایک بیچون و بیچگون بے شبہ و بے نمون خدا کی منادی
پھر گئی۔ بتوں نے عدم کا راستہ لیا۔ بت خانوں کا نشان مٹ گیا آتشکدے

[1] یہ رسالہ آپ ادارہ اسلامیات لاہور انارکلی سے طلب فرما سکتے ہیں۔

ٹھنڈے پڑ گئے تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا۔

جاء الحق و زهق الباطل — حق ظاہر ہو گیا اور باطل مغلوب ہے بلا شبہ باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے۔

ان الباطل کان زهوقا

کیا اس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشاں ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے رسول (طبیب حاذق) اور خدا ہی کی طرف سے مؤید تھے ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کر دیتا اور ایسے جنگ جو ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے تھے۔ اخوۃ کے ایک رشتہ میں باندھ دیتا اور ان کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے ان کے دلوں کو ایسا صاف کر دیتا کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا بلکہ دنیا میں اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنا دیتا۔

سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی ایسی عجیب وغریب تاثیر اور ایسی حیرت انگیز نتائج کو دیکھ کر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت سے خارج تھی چنانچہ کوئی ان میں سے کہتا ہے کہ "وہ پیام جو آپ لائے وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا جسکا مخرج وہی ہستی تھی جس کی تھاہ کبھی کسی نے نہیں پائی" کوئی لکھتا ہے "قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو" متعصب سے متعصب عیسائیوں میں سے سخت سے سخت متعصب یہ اقرار کرتا ہے کہ "دین مسیحی کی ابتداء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک کبھی حیات روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوتی تھی جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی۔"

کچھ کیا ایسی واشگاف ثبوتوں اور کھلی کھلی دلیلوں کے بعد بھی کوئی محروم البصیرۃ ایسا نکلے گا جو باوجودیکہ اپنے کو مریض سمجھتا ہو اور کسی نباض اور ماہر طبیب کی طرف رجوع کرنے کا خواہش مند بھی ہو۔ لیکن طبیب عرب (نہیں بلکہ طبیب عرب وعجم) کے ان چمکتے ہوئے کارناموں سے منہ پھیر لے۔ اور اس کی تجویز اور تشخیص کے سامنے (جو لاریب خدا ہی کی تجویز وتشخیص ہے) بے چون وچرا اور بے ریب وتردد گردن نہ ڈالدے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر اس کے بتلائے ہوئے تدابیر ومعالجات وپرہیز پر چند روز عمل کر کے نہ دیکھے۔

○ ایسے ہی کور باطنوں کی نسبت (جو ابھی تک اس طرح کی بدیہی صداقت کے تسلیم کے واسطے نہایت پیچیدہ اور دور از کار مسائل دلائل کی تلاش میں فضول سرگرداں رہ کر عمر عزیز ضائع کر رہے ہیں اور دن سے زیادہ روشن واقعات کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتے)، عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی قدس اللہ سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انسان (ہر بات میں) خدا کو چھوڑ کر محض اپنی نظر وفکر کی ہی تقلید کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی یہ فکر بھی خود اس ذات کی طرح ایک امر حادث اور مخلوق ہے اور ان قوی میں سے ایک قوۃ ہے خدائے تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت کی ہیں۔ (اُسے معلوم ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے قوۃ مفکرہ کو عقل انسانی کے واسطے ایک خادم بنایا ہے (لیکن اس پر بھی) عقل خود اس کی (خادم بن کر) پیچھے ہو لیتی ہے۔"

باوجودیکہ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ وہ قوۃ مفکرہ جو کچھ اس کو عطا کرتی ہے وہ اس میں اپنے حد و مرتبہ سے ذرا بھی تجاوز نہیں کر سکتے اور اس سے عاجز ہے کہ کسی دوسری قوۃ کی سرحد میں قدم رکھ سکتے مثلاً قوۃ حافظہ یا مصورہ کا کام اس سے نکل سکے یا قوت متخیلہ کے قائم مقام بن سکے یا حواس خمسہ (لمس طعم۔ شم۔ سمع۔ بصر) میں سے وہ کسی ایک کے فرائض کو انجام دے سکے۔

○ یہ سب کچھ ہے اور قوت مفکرہ کی حدود و اختیارات کی یہ تنگی بھی سب کو معلوم ہے۔ مگر اس پر بھی یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ عقل انسانی اپنے پروردگار کی معرفت کے بارہ میں اسی فکر ناقص کی تقلید پر اڑی ہوئی ہے اور اس کا، پروردگار خود جو کچھ اپنی کتاب میں اور اپنے رسول کی زبانی اپنی نسبت بیان فرماتا ہے اس کی تقلید سے برابر کتراتی ہے۔

عالم میں جو غلطیاں مختلف طرح کی پھیلی ہوئی ہیں عقل کی یہ غلطی ان سب میں عجیب تر ہے اور تماشہ ہے کہ سوائے ان معدود لوگوں کے جن کی بصیرت کی آنکھیں خدا تعالیٰ نے روشن کر دی ہیں ہر صاحب فکر اسی عام غلط کاری میں مبتلا ہے۔ ہاں ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک خاص فطرت بنائی اور اسی خاص فطرت کے اعتبار سے اس شئے کی عمل و حرکت کی حد بندی کر دی ہے، مثلاً قوت سامعہ (یا کانوں) کی فطرت مسموعات (آوازوں) کے ادراک سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اور عقل انسانی فقط اسی حلقہ میں اس کی محتاج اور آوازوں کی شناخت حروف کے قطع و برید۔ الفاظ کے تغیرات اور لغات کی تقسیم میں اُس سے امداد کی طالب ہے۔ چنانچہ عقل

انسانی قوۃ سامعہ ہی کے ذریعہ سے پرندوں کے چہچہے۔ ہواؤں کی سائیں سائیں کواڑوں کی چوں چوں۔ پانی کی خر خر۔ انسان کی چیخ و پکار اور دوسرے جانوروں کی بولیوں میں تفریق کرتی ہے ورنہ عقل انسانی میں بجائے خود یہ قدرت کہاں کہ بغیر توسط سمع کے ان چیزوں کے باہمی امتیازات کو قایم رکھ سکے۔

اسی طرح قوۃ باصرہ (آنکھوں) کو خیال کرو کہ اس کا دائرہ عمل محض مبصرات (دکھائی دینے کے قابل چیزوں) تک محدود ہے یعنی عقل کو اس کی امداد کے بغیر سبزی کو زردی سے اور زردی کو سفیدی سے اور سفیدی کو سیاہی سے اور اسی طرح ہر ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جدا کرنا عادۃً ممکن نہیں ہے۔ اور یہی حال ان دونوں کے ماسوا دوسری ان تمام قوتوں کا ہے جو حواس کے نام سے مشہور ہیں۔ اور نیز قوت خیالیہ کا جس کو اپنی کارگزاری میں حواس خمسہ کی احتیاج ہے۔ کیوں کہ تخیل فقط ان چیزوں کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں علیٰ ہذا القیاس قوۃ حافظہ اگر خیال کی حاصل کی ہوئی اشیا کو روکے نہ رکھے تو خیال کے خزانہ میں کچھ بھی باقی نہ رہے اس حیثیت سے جیسا کہ وہ حواس خمسہ کا محتاج ہے۔ ایسے ہی قوۃ حافظہ سے بھی بے نیاز نہیں۔ پھر قوت حافظہ کو بہت سے ایسے مواقع پیش آتے جو حواس کے اور خیال کے درمیان حائل ہو کر قوت حافظہ کی ضعف اور اس سے امور کثیرہ کے فوت ہونے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس لیے ایک قوۃ مذکرہ کی حاجت ہوتی۔ قوت حافظہ کی مددگار بن کر اس کو وہ باتیں یاد دلا دیا کرے جن سے ذہول ہو گیا ہو۔

ان سب کے بعد قوت مفکرہ خیال کی طرف متوجہ ہوتی ہے تاکہ قوۃ مصورہ کے توسط سے خیال کے حاصل کردہ امور کو اس طور پر ترکیب دے کہ اس سے کسی دعویٰ کے متعلق ایسی دلیل پیدا ہو جاوے جس کی انتہا ان محسوسات اور بدیہات پر ہوتی ہو جو آدمی کی جبلۃ میں مرکوز ہیں اس طرح سے جب فکر دلیل کو ایک اچھی طرح صورت پر قائم کر دیتا ہے تو اب عقل انسانی اس بنی بنائی چیز کو لے کر دعوی پر منطبق کر دیتی ہے۔

لیکن وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں جتنی قوتوں کو کچھ بھی دخل رہا ان میں سے کوئی ایسی نہیں جس کے کام میں بہت سے موانع اور بہت قسم کی غلطیوں کا مساغ نہ ہو اور جس کیلئے کسی ایسے معیار کی ضرورت نہ پڑے جو صحیح کو فاسد سے اور مغز کو پوست سے جدا کر سکے۔

پس تم غور کرو کہ عقل فی ذاتہ کس قدر جاہل کیسی بے بس اور دوسری قوتوں کی کتنی حاجتمند ہے اور ان قوتوں میں سے ہر ایک کو جو اغلاط پیش آتے ہیں اور جہاں تک کہ اس کے دائرہ عمل کی تحدید کی گئی وہ بھی سب پر روشن ہو چکی لیکن اس پر بھی جب اس کو کوئی بات اس مخدوش اور پر خطر طریق سے بہت سی ٹھوکریں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسری جانب خود خداوند رب العزۃ کوئی خبر دیتا ہے تو یہ کہہ کر وہ خدا کی بتلائی ہوئی بات کو ٹال دیتی ہے کہ میرا غور و فکر اس کو رد کر چکا ہے۔

اللہ اکبر یہ عقل خدا تعالیٰ کے مرتبہ سے کس قدر جاہل ہے کہ اس نے اپنے فکر ناقص کی تقلید میں خدا تعالیٰ پر جرح کرنے کو آسان سمجھا۔ حالانکہ تم پہلے

سمجھ چکے ہو کہ عقل کے پاس بجائے خود کسی طرح کا اور کسی شئے کا بھی علم موجود نہیں اس کا کام محض حواس خمسہ۔ قوۃ خیالیہ۔ قوۃ مصورہ اور علیٰ ہذا القیاس دوسری قوتوں کی عطا کئے ہوئے علوم کو قبول کرنا ہے تو ایسی حالت میں اس کے لیے نہایت ہی مناسب تھا کہ وہ بجائے قوت فکریہ وغیرہ اپنے خدام کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور ان کے عطایا قبول کرنے کے اپنے آقا رب العزۃ کے روبرو ہاتھ پھیلاتے اور اسی کی بخششوں کو لے کر سر اور آنکھوں پر رکھتے۔

اور جب کہ اسے معلوم ہے کہ اس کا فکر خیال کا مقلد ہے اور خیال حواس خمسہ کا اور اس کے ساتھ ہی اس کو اپنی امداد کے لیے قوۃ حافظہ اور ذاکرہ کی بھی حاجت ہے اور یہ بھی علم ہے کہ یہ تمام قوی اپنی اپنی سرحد فطرۃ اور دائرہ عمل سے باہر ایک قدم نہیں رکھ سکتے (مثلاً خوبصورت بدصورت کے ادراک میں کانوں سے کام نہیں چل سکتا اور آوازوں کے بُرے بھلے کو آنکھیں نہیں سمجھ سکتیں خوشبو اور بدبو کا امتیاز زبان کے حدود عمل سے خارج ہے اور تلخ و شیریں کی تفریق سے ناک کو کوئی سروکار نہیں اور علیٰ ہذا القیاس خود عقل کو اپنی ذات کے اعتبار سے ان چند ضروریات کی سوا جن کا علم فطرۃً ہوتا ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں، تو بھلا تمام قوتوں کے اس طرح کی تنگ میدانی اور بیچارگی کے باوجود بھی کیا وجہ ہے کہ ہماری عقل اس شخص کے قول کو قبول نہیں کرتی جو انسان میں قوۃ مفکرہ کے سوا ایک اور ایسی قوت کا قائل ہے جس کے احکام قوۃ مفکرہ کے احکام سے بالاتر ہوں اور

جس کو ان طریقوں کے استعمال کرنے سے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے لکھے ہیں بموہبت الہی اہل اللہ (ملائکہ، انبیاء اور اولیاء کاملین اپنے اندر پاتے ہیں اور کل کتب سماویہ جس کے وجود کی خبر دینے میں بآواز دہل ناطق ہیں۔

○ اس لئے تم کو چاہیئے کہ اخبار الہیہ کے ماننے میں اپنے عقول (ناقصہ سقیمہ) کی کچھ پرواہ نہ کرو اور مخلوق کے مقابلہ میں خالق کی تقلید کو بہتر سمجھو کیونکہ کثیر التعداد انبیاء و اولیائے انہیں چیزوں کو قبول کیا اور انہیں پر وہ ایمان لائے۔ اور انہیں کی تصدیق کی۔ اور ہمیشہ وہ اسی کو پسند کرتے رہے کہ اپنے رب کی معرفت میں خود اسی کی تقلید کرنا اپنے اوہام و افکار کی تقلید سے اولیٰ و انفع ہے۔ پھر اور عقلمند بن کر اخبار الہیہ سے انکار کرنے والے تجھ کو کیا ہوا کہ خدا کے بارے میں تو خود خدا کی اور اس کے برگزیدہ بندوں کی نہیں سنتا اور اپنے خیالات کے پیچھے پڑا پریشان ہو رہا ہے؟؟

دیکھو جب یا ایھا الذین آمنوا آمنوا کے سننے والوں کو یہ معلوم ہوا کہ علاوہ اس ایمان کے جو دلائل و افکار سے ہم کو حاصل ہو چکا کوئی دوسرا ایمان بھی مطلوب ہے تو انہوں نے مع ریاضت خلوۃ اور مجاہدہ کا طریق اختیار کیا اور خدا کو فراموش کرانیوالے تعلقات کو یک لخت منقطع کر کے دنیا میں رہ کر ہی وہ دنیا سے الگ ہو بیٹھے۔ اور دل کو سب جھگڑوں سے خالی اور قلب کو شوائب افکار سے پاک کر کے خالص خدا کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیونکہ انبیاء و مرسلین سے یہی راستہ ان کو معلوم ہوا تھا اور انہوں نے سن رکھا تھا کہ بندہ جب سارے دل سے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس پر اپنی

مہربانی اور رحمت کا سایہ ڈالتا ہے اور اپنے دامن عطوفت میں لے لیتا ہے اس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا کی طرف جانے والوں کے لئے فکر کے رستے سے یہ راستہ زیادہ نزدیک ہے کیونکہ خود خداوند رب العزت نے اپنے رسول کی زبان سے یہ منادی کرادی کہ جو کوئی ہماری طرف لپک کر آتا ہے ہم اس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔ اور یہ کہ نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ بلکہ فقط قلب مومن میں یہ وسعت ہے کہ وہ ہماری عظمت و جلال کا تحمل کر سکے۔

اس بناء پر یہ لوگ اپنے سارے دل سے خدا کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے اور تمام قوی و افکار کے دھندوں کو چھوڑ دیا۔ اسوقت خدا تعالیٰ نے اپنے نور و علم صادق کی ایک روشنی ان کے دلوں پر ڈالدی۔ اور ان کو خالص اپنا ہی والا و شیدا بنالیا۔ پھر کیا تھا۔ نظر و فکر کی وہ ساری کمزوریاں کافور ہو گئیں اور خالق اکبر کے ارشادات و قوانین کے سامنے انہوں نے اپنی عقلوں کے تیار کئے ہوئے قانون کو بھلادیا۔ آہ

○ تم خود سوچو اور انصاف کرو کہ اگر ہر کس و ناکس اپنی عقل شخصی کے بنائے ہوئے قانون پر چلنے کا مجاز کر دیا جائے جیسا کہ آزاد خیالی کے مدعی آج کل چاہتے ہیں تو دنیا میں کیا کچھ خربطہ ہو اور ہزاروں لاکھوں تراشیدہ قوانین کی کشمکش میں (جو ہر گروہ اپنے پیمانۂ فکر اور اندازۂ فہم کے موافق تیار کر سکتا ہے لوگوں کی زندگی کیا کچھ دشوار ہو جائے۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب عقل و نقل میں مزاحمت واقع ہوا کرے اس وقت ہم کو یہ اختیار ملنا چاہیئے کہ ہم عقل کے احکام کو نقل صحیح

کی تسلیم سے مقدم سمجھیں کیونکہ نقل کے ماننے کا اصل ذریعہ یہی عقل ہی ہے تو خدانخواستہ عقل کو بے اعتبار ٹھہرانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم عقل ونقل دونوں کی طرف سے بدگمان ہو گئے ہیں۔

لیکن اس شبہ کا جواب آپ کو ہماری تقریر سابق سے بوجہ احسن معلوم ہو چکا ہے کیونکہ ہم مدلل طور پر بتلا چکے ہیں کہ عقل سلیم ونقل صحیح میں تعارض ہو ہی نہیں سکتا ہاں اگر عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت مخدوش ہو جائے تو بیشک ایسا ہونا ممکن ہے مگر اس وقت ہمارا پہلا فرض یہ ہوگا کہ یا تو اپنی عقل کو مرض سے چھڑانے اور سلامتی پر لانے کی کوشش کریں اور یا نقل کے ثبوت کے واسطے کوئی قابل وثوق ذریعہ بہم پہنچائیں۔ ودونہ خرط القتاد۔

اس جواب کی پوری تفصیل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اپنی بیش بہا اور ضخیم کتاب[1] بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول میں لکھی ہے جس کے جستہ جستہ اقتباسات بھی ہم باوجود قصد کے تطویل کے خیال سے قلم انداز کر کے آخر میں یہ گزارش کرتے ہیں کہ:۔

جو کچھ ہم نے اس مضمون میں یہاں تک بیان کیا ہے اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ فکر واستدلال ایک محض عبث اور لغو چیز ہے یا اس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہے لیکن ہاں کسی فرد بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی عقل شخصی اور فکر ناقص کو اصل اصول ٹھہرا کر انبیاء علیہم السلام کے پاک و

[1] یہ کتاب اہل مصر نے منہاج السنۃ کے حاشیہ پر طبع کی ہے۔

صاف صحیح وصادق اور بلند وبرتر تعلیمات کو زبردستی ان پر منطبق کرنے کی کوشش کرے جس پر اکثر اوقات اس کا ضمیر بھی خود اندر سے نفرین کر رہا ہو۔ اس کے برخلاف نہایت ضروری ہے کہ انسان خدا اور اس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل قرار دے کر اپنی عقلی معلومات کو ان کے تابع بنا رہے اور جو کچھ وہ فرمائیں اس کو اپنے امراض روحانی کے حق میں اکسیر شفا تصور کر کے سمعاً وطاعۃً کہتا ہوا بلا حجت وتکرار سر اور آنکھوں پر رکھے۔

والذین یحاجون فی اللہ، من بعد ما استجیب لہ حجتہم داحضۃ عند ربہم وعلیہم غضب ولہم عذاب شدید۔	اور جو لوگ اللہ کے بارہ میں نبی سے جھگڑا کرتے ہیں جبکہ آدمی اسکی بات قبول کر چکے تو ان کی حجت باطل ہے اور ان پر خدا تعالیٰ کا غضب ہے اور ان کیلئے سخت عذاب ہے۔

تنبیہ:۔ جو کچھ ہم نے اس رسالہ میں اپنے نزدیک اختصار جامع اور متانت ومعقولیت کے ساتھ لکھا ہے اس کا زیادہ تر زور (جیسا کہ ناظرین محسوس فرمائیں گے)، عقل کی صحت وسلامتی پر رہا ہے۔ لیکن نقل کی صحت وضعف کے قواعد وشرائط وغیرہ سے یہاں مطلقاً بحث نہیں کی گئی جس کے واسطے اول تو علم اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہوگا اور اگر وقت نے مساعدت اور قادر مطلق نے امداد فرمائی تو ہم ایک مستقل رسالہ اس موضوع کے متعلق بھی لکھ کر اہل ملک کے روبرو پیش کریں گے جس میں مولانا عبداللہ العمادی کے رسالہ علم الحدیث پر بھی مبسوط تبصرہ کیا جاوے گا۔

وما ذالك على الله بعزيز و اخر دعونا ان الحمد لله رب العٰلمین۔

الراقم
شبیر احمد عثمانی ۔عفا اللہ عنہ
دار العلوم دیوبند
۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ

تمت بالخیر

مستند دینی کتابیں